مارچ ۱۹۸۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعتِ خصوصی

مدیر تکبیر کی خدمت میں اور بھٹو مرحوم بھٹوازم جمہوریت سوشلزم مذہبی سیاست اور نظامِ بیعت کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کی وضاحتیں

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

سیمنٹ تعمیر کے لیے
اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا
کیک کے لیے میدہ

آج تک پاکستان میں ہونے والی ہر قسم کی تعمیر کے ۹۰ فی صد
سے زائد میں سیمنٹ استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ
سیمنٹ سیمنٹ کے اعلیٰ معیار پر لوگوں کا مکمل اعتماد ہے
اچھی تعمیر اور سیمنٹ سیمنٹ لازم و ملزوم ہیں
انتخاب مبارک ہو

سیمنٹ سیمنٹ کارپوریشن
آف پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت

جلد: ۳۸
شمارہ: ۳
رجب ۱۴۰۹ھ
مارچ ۱۹۸۹ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر
اقتدار احمد
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا - ۶ - امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ - ۹ - امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ - ۱۲ - امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ - ماڈل ٹاؤن فیروز پور روڈ - لاہور (پاکستان)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴
سب آفس: ۱۱ - داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

■ تذکرہ وتبصرہ ——— ۵
مدیر 'تکبیر' کی خدمت میں چند گزارشات

ڈاکٹر اسرار احمد

■ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اور بھٹو ازم ——— ۴۳
جمہوریت، سوشلزم' اور اسلام ——— اور
پاکستان کی مذہبی سیاست
کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کی ۷۰-۱۹۶۹ء کی تحریروں کے اقتباسات

■ مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت ——— ۷۱
کے ضمن میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے پر ادارہ 'تکبیر'
کا محاکمہ اور ڈاکٹر صاحب کی وضاحت

■ حسنِ انتخاب ——— ۷۹
قربِ الٰہی کے دو راستے

مولانا محمد منظور نعمانی

■ بلا تبصرہ ——— ۹۰
ڈاکٹر اسرار احمد اور پروفیسر طاہر القادری کے قتل کی
قادیانی سازش کے بارے میں اخباری اطلاعات کا عکس

ان شاء اللہ **تنظیمِ اسلامی پاکستان** کا چودھواں

سالانہ اجتماع

۲۹ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء — گارڈن ٹاؤن لاہور کے اتاترک بلاک میں واقع

قرآن آڈیٹوریم

میں منعقد ہوگا۔ تنظیم کے رفقاء و احباب ۲۸ اور ۲۹ مارچ کی درمیانی شب کو لاہور ضرور پہنچ جائیں۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر ۲۸ مارچ کو ۵ بجے شام تا ۱۲ بجے شب استقبالیہ کیمپ قائم رہے گا۔ بعد میں آنے والے حضرات کو خود قرآن آڈیٹوریم یا قرآن اکیڈمی پہنچنا ہوگا۔ شرکاء اجتماع موسم کے مطابق بستر کے علاوہ ایک ایک پلیٹ اور چائے کے لیے ایک ایک کپ یا چھوٹا مگ ضرور ساتھ لائیں۔

رفقاءِ تنظیم نوٹ فرمالیں کہ سالانہ اجتماع میں شرکت لازمی ہے!

مزید برآں ۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۹ء

ایک نہایت مفید **تعلیمی و تربیتی پروگرام** جاری رہے گا

مقامی تنظیموں کے اُمراء اور نقباء اور وہ رفقاء جنہوں نے مبتدی تربیتی نصاب کی تکمیل کر لی ہے اس میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کی حتی الامکان کوشش کریں اور اس کے لیے جمعرات ۲۳ مارچ کی دوپہر تک لازماً قرآن اکیڈمی پہنچ جائیں

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و مددگار ہو

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے اِس سال کے **محاضراتِ قرآنی** کا مجموعی عنوان

اِسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی

ہوگا جس میں ——— انجمن کے صدر مؤسس

ڈاکٹر اِسرار احمد

جناح ہال لاہور میں ۲۴ تا ۲۸ مارچ ۸۹ء روزانہ بعد نماز مغرب

——— حسبِ ذیل پروگرام کے مطابق خطاب فرمائیں گے: ———

جمعہ ۲۴ مارچ : اِسلام میں عدل و قسط کی اہمیت،

ہفتہ ۲۵ مارچ : اِسلام کا نظامِ معاشرتی عدل، اور
مرد اور عورت کے درمیان حقوق و فرائض کا منصفانہ توازن،

اتوار ۲۶ مارچ : اِسلام کا نظامِ عدلِ معاش و کفالتِ عامّہ،

پیر ۲۷ مارچ : اِسلام کا نظامِ سیاسی و حریتِ انسانی،
اور عالمی امن کے قیام کا قرآنی منصوبہ

منگل ۲۸ مارچ : نظامِ عدل و قسط کے قیام کا نبوی طریقِ کار!

نوٹ : اِن شاء اللہ خطاب ڈیڑھ گھنٹے پر مشتمل ہوگا اور اس کے بعد لگ بھگ اتنا ہی وقت سوال جواب کے لیے ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

——— ڈاکٹر اسرار احمد ———

الحمدللہ کہ محترم صلاح الدین صاحب نے ہمارے گزشتہ ماہ کے "تذکرہ و تبصرہ" کے 'جوابِ آں غزل' کے لئے اپنے مؤقر جریدے (تکبیر ۲۳ر فروری ۸۹ء) کے ساڑھے سات سے زائد صفحات وقف کرنے کے باوجود عہد جدید کی اسلامی ریاست اور اس میں قانون سازی کے ضمن میں اجتہاد کے موضوع پر ایک حرف نہیں لکھا..... حالانکہ اس سے قبل اس موضوع پر ان کی خامہ فرسائی ڈھائی صفحات پر پھیلی ہوئی تھی اور محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب اور حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کے نام اپنے جو خطوط انہوں نے حالیہ شمارے میں شائع کئے ہیں ان میں بھی انہوں نے راقم پر "علامہ اقبال کی فکر" کو "مسخ کرنے کی کوشش" کا الزام عائد کیا ہے.....!

اس کا سبب بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ اس معاملے میں راقم کی وضاحت سے راقم الحروف اور علامہ اقبال مرحوم دونوں کے بارے میں ان کی غلط فہمی بھی رفع ہو گئی ہے اور وقت کے اس اہم ترین مسئلے کے بارے میں ان کی ذہنی الجھن بھی حل ہو گئی ہے۔

..... اس سلسلے میں اگر وہ واضح اعتراف بھی کر لیتے تو اس میں ہرگز کوئی سُبکی والی بات نہ تھی 'بلکہ اس سے ان کا اخلاقی تشخّص مزید مستحکم ہوتا..... اور اہم تر بات یہ ہے کہ ان کی تحریر کے ایک نہایت وسیع حلقے میں شائع ہونے کے باعث جو شکوک و شبہات اور خاص طور پر علامہ اقبال مرحوم ایسی محترم شخصیت سے جو سُوءِ ظن بہت سے لوگوں کے قلوب و اذہان میں پیدا ہوا اس کے ازالے کی صورت بن جاتی! ..... ہمیں امید ہے کہ 'مدیرِ تکبیر' معاملے کے اس پہلو پر ضرور غور فرمائیں گے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو ہم یہ گزارش بھی کریں گے کہ وہ ہماری تحریر کا وہ حصہ اپنے مؤقر جریدے میں مِن و عَن شائع کر دیں جو اس

موضوع سے متعلق ہے! اس سے 'ان شاء اللہ العزیز' عہدِ جدید کی اسلامی ریاست کے بارے میں بہت سے ذہنوں کی الجھنیں دور ہو جائیں گی..... واللہ اعلم!!

اس سے پہلے کہ "عالم من وتو" کی "گفت و گو" کا آغاز کیا جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اسی افہام و تفہیم کی فضا میں اُن دو تین علمی و فکری مغالطوں کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے جو ان کی تازہ تحریر میں نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں:

(۱) ان میں اولین اور اہم ترین معاملہ وہ ہے جس پر ان کی تحریر کا اختتام ہوا ہے اور جس پر انہوں نے نہایت متحدّیانہ (CHALLENGING) انداز میں اس عاجز و ناچیز کو تحریری یا تقریری مباحثے اور مناظرے کی دعوت دی ہے! یعنی "اسلامی ریاست میں شوریٰ کی رکنیت" کے ضمن میں علم اور کردار کی شرائط کا مسئلہ!

اس ضمن میں، صلاح الدین صاحب برا نہ مانیں، ہمیں تو معاملہ "آ پڑوسن جنگ کریں!" والا نظر آتا ہے، اس لئے کہ اس مسئلے میں ہمارے اور اُن کے مابین کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ چنانچہ اگر وہ گزشتہ ماہ کے 'میثاق' کے صفحہ ۸۳ پر یہ چار سطور دوبارہ پڑھ لیں کہ:

> "میں نے وضاحت کر دی تھی کہ اضافی شرائط کے ضمن میں جیسے ووٹر کی عمر کا معاملہ ہے جو مختلف جمہوری ممالک میں مختلف ہے، اسی طرح تعلیم اور کردار کی اضافی شرائط بھی عائد کی جا سکتی ہیں..... لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہو گا جمہور کی رضامندی سے! (اس لئے کہ دستورِ مملکت جمہور کی رضامندی ہی سے بن سکتا ہے!)

اور اس کے ساتھ ساتھ صفحہ ۹۱ کی ان سطور پر بھی نگاہ ڈال لیں کہ:

> "بحالات موجودہ اسلام کے سیاسی اور ریاستی نظام کے موضوع پر گفتگو میں ایک خلط مبحث اس بنا پر بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اصولی بحث کرتے کرتے لوگ اچانک اس کا جوں کا توں انطباق موجود الوقت حالات پر کرنے لگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ کہاں ہمارا موجودہ مسلمان معاشرہ اور کہاں اسلامی ریاست، ع "چہ نسبت خاک را با عالم پاک!"..... اس خلط مبحث کے نتیجے میں اسلامی ریاست کی بحث وقتی سیاسی محاذ آرائیوں اور چپقلشوں کے خارزار میں الجھ کر

رہ جاتی ہے اور وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے جس سے مدیر ' تکبیر ' اس وقت شدت کے ساتھ دوچار ہیں!....."

تو' ان شاءاللہ العزیز' وہ خود ہی محسوس کر لیں گے کہ اس موضوع پر وقت و قوت اور قلم و قرطاس کا ضیاع لاحاصل ہے!

البتہ عام قارئین کے افادہ کے لئے اس معاملے میں دو باتوں کی وضاحت مناسب ہے۔

۱- ایک یہ کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عہد حاضر کی اسلامی ریاست ایک THEO-DEMOCRACY یعنی مذہب اور جمہوریت کا 'امتزاج' ہوگی (یہ بات اتنے واضح الفاظ میں اولاً مولانا مودودی مرحوم نے فرمائی تھی' اور اس پر نہ صرف یہ کہ میرا اور صلاح الدین صاحب کا اتفاق ہے بلکہ ہمارا گمان ہے کہ کوئی باشعور انسان اس سے اختلاف نہیں کرے گا۔) تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس میں توحید کے لازمی منطقی تقاضے یعنی اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کے ساتھ ساتھ (اور یقیناً اُس کے تابع!) کسی نہ کسی درجہ میں جمہوریت کے اصل الاصول یعنی " حاکمیتِ عوام " کا عمل دخل بھی ہو..... یہاں حاکمیت عوام کی اصطلاح ہم نے جان بوجھ کر استعمال کی ہے تاکہ لوگ چونک جائیں اور ذہن پوری طرح بیدار کر کے غور کریں۔

اس " حاکمیت عوام " کی اساس زندگی کے لائحہ عمل کے بارے میں انتخاب و اختیار کی وہ آزادی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عطا فرمائی ہے۔

اس آزادی و اختیار کا اولین ظہور "اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا" کے مطابق شکر و کفر اور اسلام و انکار کے مابین کسی روش کے انتخاب کی صورت میں ہوتا ہے جسے "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" کے الفاظ مبارکہ کے ذریعے نہایت مؤکد کر دیا گیا ہے! (یہاں اخروی جزاء و سزا اور عقوبت و ثواب کے علاوہ کسی اسلامی ریاست کے مسلمان شہری کے مرتد ہو جانے کے معاملے کو بھی علیحدہ رکھا جائے اس لئے کہ وہ ایک استثنائی معاملہ ہے اور جداگانہ فنی بحث کا متقاضی ہے!)

پھر جس طرح کسی فرد کے مسلمان یا کافر ہونے کا دارومدار اس کے انفرادی فیصلے یا انتخاب و اختیار پر ہے اُس طرح کسی ملک کے "اسلامی ریاست" کی صورت اختیار کرنے کا انحصار بھی اس کے شہریوں کے اجتماعی فیصلے اور مجموعی ارادے (COLLECTIVE WILL) پر ہے۔ جو یا بصورت انقلاب ظہور پذیر ہوتا ہے یا بذریعۂ انتخاب! ان میں سے پہلی صورت میں ایک منظم اقلیت اپنی محنت و مشقت اور قربانی و ایثار کے بل پر فیصلہ کن حد تک غالب ہو جاتی

ہے، جبکہ دوسری صورت میں فیصلے کا دارومدار رائے دہندگان کی عددی اکثریت پر ہوتا ہے!

اسلامی ریاست کے قیام کے فیصلے کے بعد بھی ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ عوام کے ارادہ و اختیار کی آزادی کلیتہً سلب ہوجائے بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی "حاکمیت مطلقہ" اور عوام کی "حاکمیت محدودہ" کے مابین ایک حسین امتزاج قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی جس طرح ایک فردِ مسلم مباحات کے دائرے میں آزاد ہے کہ مختلف مباح چیزوں میں سے جسے چاہے اختیار کرلے اسی طرح اسلامی ریاست میں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح احکام یا بالفاظ دیگر کتاب وسنّت کے نصوص کی حدود کے اندر اندر جملہ ملکی و مملکتی، قانونی و دستوری، اور مالی وانتظامی معاملات میں جمہور کو "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کے مطابق کامل آزادی حاصل رہتی ہے۔ جس کے ضمن میں تمدنی ارتقاء کے اعلیٰ ترین ثمرات اور جمہوریت کی بلند ترین اقدار کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ اور جمہور کی محدود حاکمیت کے مابین تناسب وتوازن کی بہترین تعبیر اس حدیث نبویؐ کی مدد سے کی جاسکتی ہے کہ:

"مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ فِيْ اٰخِيَتِهٖ"..... یعنی بندۂ مومن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو کسی کھونٹے سے بندھا ہوا ہو۔ یعنی مسلمان بے لگام اور بگٹٹ یا مادر پدر آزاد نہیں ہوتا بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کا "پابند" ہوتا ہے۔ اسی تشبیہ کو آگے بڑھاتے ہوئے فرض کیجئے کہ ایک وسیع وعریض میدان میں آپ یہ بھی چاہتے ہوں کہ گھوڑے کو چرنے چگنے اور اپنے پاؤں کھولنے کی آزادی حاصل رہے لیکن ساتھ ہی یہ احتیاط بھی کرنا چاہیں کہ کہیں وہ بھاگ ہی نہ جائے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ اسے ایک بہت لمبی رسّی کے ساتھ کسی کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔ اب فرض کیجئے کہ وہ رسّی سو گز لمبی ہے تو اس کھونٹے کے گرد سو گز نصف قطر کا ایک دائرہ وجود میں آجائے گا جس میں وہ گھوڑا کاملتہً آزاد ہوگا کہ جس رخ پر چاہے چلا جائے، اور خواہ کھڑا رہے خواہ لوٹ لگائے، لیکن کسی بھی سمت میں اس دائرے سے باہر نکلنا اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ ایک مسلمان کی انفرادی زندگی ہو یا عہد جدید کی اسلامی ریاست کا دستوری ڈھانچہ دونوں میں اس دائرے کی حیثیت تو حاصل ہے "حدود اللہ" یعنی کتاب وسنّت کے واضح احکامات کو..... گویا یہ دائرہ مظہر ہے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کا، اور اس دائرے کے اندر اندر عملداری ہے "حاکمیتِ عوام" یا "سلطانیٔ جمہور" کی! جس میں جملہ اصولی رہنمائیوں اور تمام تر اخلاقی تعلیمات کے باوصف آخری

تجزیئے میں فیصلہ کن عمل دخل حاصل ہو گا رائے دہندگان کی کثرتِ رائے کو۔

چنانچہ اگر کسی مسلمان ملک کے شہری اپنے نمائندوں کی اکثریت کی رائے سے یہ طے کر لیں کہ یہاں پارلیمنٹ کی ممبری کا استحقاق ہی نہیں ووٹ کا بنیادی حق بھی صرف اُس شخص کو حاصل ہو گا جو نہ صرف یہ کہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے شریعت اسلامی میں قبولیتِ شہادت کے کم از کم معیار پر پورا اترتا ہو' بلکہ دین کے علم کی بھی ایک کم از کم معیّن مقدار کی تحصیل کر لے تو اس پر کسی بڑے سے بڑے جمہوریت پسند کو بھی کسی اعتراض کا حق حاصل نہ ہو گا۔ (بنابریں پاکستان کے موجودہ دستور کے آرٹیکل ۶۲ اور ۶۳ کے حوالے سے محترم صلاح الدین صاحب کو پورا حق حاصل ہے کہ عدالت کا کنڈا کھٹکھٹائیں..... بلکہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ' خود اپنے الفاظ کے مطابق "مطلق العنان حکمران سے ساڑھے گیارہ سالہ راہ و رسم" کے ذریعے کچھ مزید شرائط مثلاً کسی خاتون کے صدر مملکت یا سربراہ حکومت بننے پر پابندی بھی عائد کرا لیتے! تاکہ موجودہ پریشان کن صورت حال پیدا ہی نہ ہوتی.....!)

اس سلسلے کی دوسری ضروری اور اہم وضاحت یہ ہے کہ جسدیر' تکبیر' یہ فرماتے ہیں کہ "اسلامی جمہوریہ میں شوریٰ (پارلیمنٹ) کی رکنیت کے لئے مستشار (رکن شوریٰ) کی جو بنیادی شرائط آج تک متفق علیہ چلی آ رہی ہیں" تو اس سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ شاید مسلمانوں کی پوری تاریخ کے دوران "قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کرنے اور اولی الامر (کابینہ) کا تقرر کرنے والی شوریٰ" کے انتخاب میں شرکت کے لئے "امیدواروں کی شرائطِ اہلیت" بالفعل نافذ رہی ہیں' جبکہ واقعۃً خلافت راشدہ کے عہدِ زرّیں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی پوری پونے چودہ سو سالہ تاریخ میں نہ کبھی کسی پارلیمنٹ کا وجود رہا ہے نہ شوریٰ کا! اور حکومت و مملکت کا پورا ڈھانچہ یا قبائلی عصبیت پر قائم رہا ہے یا جاگیرداری نظام پر' ہاں عدلیہ کا وجود ضرور رہا ہے اور اس میں "تقرری" کے ضمن میں حکمران کی ذاتی پسند و ناپسند کے ساتھ ساتھ مناسب لحاظ اہلیت اور قابلیت کا بھی رہا ہے!..... مزید برآں خلافت راشدہ کے دوران بھی شوریٰ کے انتخاب کا مرحلہ کبھی پیش نہیں آیا کہ "امیدواروں کی شرائطِ اہلیت" کا سوال عملاً پیدا ہوتا اس لئے کہ وہاں تو ایک طویل اور جانگسل انقلابی جدوجہد کے دوران سبقت و مسابقت' ایثار و قربانی' اور سرفروشی و جانفشانی کی بنیاد پر لوگوں کے مابین ایک درجہ بندی از خود ہو گئی تھی کہ یہ حضرات "السّابقون الاوّلون" میں سے ہیں" یہ "اصحاب بدر" ہیں' یہ "اصحابُ الشّجرہ" ہیں' رضی اللہ تعالیٰ عنہم و ارضاھم

اجمعین!..... گویا وہاں نہ ' امیدواری ' تھی نہ انتخاب ' تو شرائط امیدواری کا ذکر چہ معنی دارد!!

محترم صلاح الدین صاحب سے مخلصانہ درخواست ہے کہ وہ اِس حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں کہ ایک 'جمہوریہ' (REPUBLIC) کا خواب تو نوعِ انسانی نے یقیناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لگ بھگ ایک ہزار سال قبل افلاطون کی چشمِ تصور کے ذریعے دیکھ لیا تھا۔ لیکن جیسے ایچ جی ویلز نے کہا ہے کہ "انسانی حریّت 'اخوّت اور مساوات کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان اصولوں پر بالفعل ایک معاشرہ پہلی بار قائم کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے۔"

اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ ایک حقیقی جمہوریہ تاریخ انسانی میں پہلی بار قائم ہوئی تھی نبی اکرمؐ کے دستِ مبارک سے خلافت راشدہ کی صورت میں 'اور اس کے خاتمے کے بعد ایک لادین جمہوریت کا ظہور ہوا اب سے دو سو سال قبل یورپ میں 'رہی "اسلامی جمہوریہ" تو اس کے لئے تو مادرِ گیتی چشم براہ ہے کہ دوبارہ[1] کب اور کہاں جلوہ آرا ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں بھی اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک بار پھر پڑھ لئے جائیں راقم کے درج ذیل الفاظ:۔

"ان سطور کے راقم کو اس بات پر تو ایمان بھی حاصل ہے اور یقین بھی کہ پورے کرۂ ارضی پر ایک عالمی اور مثالی اسلامی ریاست قائم ہو کر رہے گی۔ اور ایک گمان (یا خوش فہمی؟) یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز مملکت خداداد پاکستان ہی سے ہو گا..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ ابھی ہم اس سے بہت دور ہیں اور ایک طویل جدوجہد اور جانگسل محنت و مشقت بلکہ آگ اور خون کے بہت سے دریا راستے میں حائل ہیں! اور بڑے ہی دل گردے کے مالک اور ہمّت و عزیمت کے پیکر مجسم ہوں گے وہ لوگ جو یہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس کے لئے کمر ہمّت کس لیں!..... اسلامی ریاست کے قیام کے آرزومندوں اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے خواہشمندوں کو جان لینا چاہئے کہ فی الوقت اصل ضرورت ایسے صاحبِ عزیمت لوگوں کی تلاش اور انہیں کسی مضبوط تنظیمی ڈھانچے کی صورت

---

[1] جامیؔ کی نعت کا مشہور شعر ہے۔

مشرّف گرچہ شد جامیؔ زلطفش خدایا آں کرم بارِ دگر کن!

میں بنیان مرصوص بنانے کی ہے۔

میں کہ مری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!"

(میثاق فروری ۸۹ء صفحہ ۹۱)

---

(۲) محترم صلاح الدین صاحب کی حالیہ تحریر کا دوسرا بڑا مغالطہ نظامِ بیعت سے متعلق ہے۔ اس ضمن میں اوّلاً تو' اگر اس پر "مگس کو باغ میں جانے نہ دینا۔ کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا!" کی پھبتی نہ چست کی جائے' تو یہ عرض کروں گا کہ محترم صلاح الدین صاحب نے مجھ پر نادانستہ طور پر کفر کا فتویٰ لگا دیا ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے میری اور تنظیم اسلامی کی جانب "غیر مشروط سمع وطاعت" کو منسوب کر کے (واضح رہے کہ یہ الفاظ دوہرے واوین میں درج کئے گئے ہیں) "كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ○" کے مصداق بہت بڑا افتراء اور عظیم تہمت تراشی کی ہے!..... اگرچہ یہ سب کچھ ہوا ہے کچھ اسلامی اصطلاحات سے ناواقفیت کی بنا پر اور کچھ اُسی کیفیت کے زیر اثر جس کا ذکر اُس حدیث نبویؐ میں ہے جس کا حوالہ گزشتہ ماہ کے 'تذکرہ وتبصرہ' میں آچکا ہے..... یعنی "تمہارا کسی چیز سے محبت کرنا تمہیں اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے!"

ورنہ یہ بات یقیناً محترم صلاح الدین صاحب کے علم سے باہر نہیں ہو سکتی کہ اسلام کے اساسی عقیدے یعنی توحید کی رُو سے مطلق اور غیر مشروط اطاعت صرف اللہ تعالیٰ یا اس کے نمائندے کی حیثیت سے اس کے کسی نبی یا رسول ہی کی ہو سکتی ہے' اور "غیر مشروط سمع و طاعت" کی بیعت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کی نہیں کی جا سکتی' اور اگر کی جائے تو جو ایسی بیعت کرے وہ بھی' اور جس کی بیعت کی جائے وہ بھی کفر کے مرتکب ہوں گے۔ اس لئے کہ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جس شخص سے یہ بیعت کی گئی اسے یا تو 'اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ' میں شامل کر لیا گیا ہے یا بصورتِ دیگر نبی یا رسول تسلیم کر لیا گیا ہے! اعاذنا اللہ من ذالک!..... بہرحال مدیر 'تکبیر' اور ان ہی کے مانند مغالطوں میں مبتلا دوسرے حضرات نوٹ فرمالیں کہ تنظیم اسلامی "بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف" یعنی کتاب و سُنّت کے نصوص کے اس دائرے کے اندر اندر سمع وطاعت کے معاہدے پر قائم کی گئی ہے

جس کی مفصل وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

اس پیچ در پیچ مغالطے کی دوسری کڑی یہ ہے کہ "فلسفۂ بیعت آزادیٔ اظہار اور آزادیٔ اختلافِ رائے کو لوہے کے دانتوں سے پکڑ لیتی (یعنی لیتا) ہے"..... یہاں مدیر 'تکبیر' کی 'نادانستگی' کے جوہر کچھ مزید نمایاں ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے اس 'مطلق العنان' بیان..... یعنی 'CATEGORICAL STATEMENT' کی زد ع "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!" کے مصداق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر بھی پڑ رہی ہے۔ محترم صلاح الدین صاحب ذرا ہوش کے ناخن لیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت تو غیر مشروط تھی اس کے باوجود ان کے عہدِ سعادت میں رائے اور اظہار کی ایسی آزادی تھی جیسی نہ کبھی پہلے رہی تھی نہ بعد میں آج تک سامنے آ سکی ہے۔ اسی طرح خلافتِ راشدہ کا نظامِ حکومت بھی اگرچہ "بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف" پر مبنی تھا، لیکن ان کے دور میں کامل آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار پر مستزاد دوسرے امراء و عاملین ہی نہیں خود خلیفۂ راشد اور امیر المومنین پر ذاتی تنقیدوں تک کی کھلی آزادی تھی!..... گویا کسی نظمِ جماعت یا ہیئتِ تنظیمی کا مغرب سے درآمد شدہ دستوری و جمہوری اساس پر قائم ہونا یا بیعت کے مسنون و ماثور طریقے پر مبنی ہونا ایک جداگانہ بحث ہے..... اور آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار کا معاملہ بالکل جدا ہے!! اور یہ عین ممکن ہے کہ کسی دستوری (اور ظاہری طور پر جمہوری) جماعت میں 'آزادیٔ اظہارِ رائے' کو پورے قانونی اور دستوری انداز ہی میں پابند سلاسل کر دیا جائے اور آزادانہ تبادلۂ خیال کو (نجویٰ کی قرآنی اصطلاح کی غلط اور خود ساختہ تعبیر کے حوالے سے) ممنوع قرار دے کر نیم واقف، یا ناواقف یا مغالطوں میں مبتلا (MISINFORMED) لوگوں کی "کثرتِ رائے" کی بنیاد پر جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹا جائے..... اور اس کے بالکل برعکس یہ بھی عین ممکن ہے کہ شخصی بیعت کی بنیاد پر قائم ہونے والی اجتماعیت میں اظہارِ رائے اور تنقید کی کھلی آزادی ہو۔ اور آزادانہ بحث و مباحثے اور اور تبادلۂ خیال کی فضا بدرجۂ اتم قائم رکھی جائے۔ اگرچہ آخری فیصلہ ع "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!" کے مصداق ووٹوں کی گنتی سے نہ کیا جائے بلکہ پوری بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ اُس شخص پر چھوڑ دیا جائے جس سے بیعت کی گئی ہو! چنانچہ اس کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت تو وہ ہے جو اوپر پیش ہو چکا..... یعنی دورِ خلافتِ راشدہ کا ماحول..... اور ایک

دوسرا جیتا جاگتا ثبوت ' جو اس کے مقابلے میں تو یقیناً نہایت حقیر اور ادنیٰ ہے لیکن موجود الوقت احوال وظروف کے اعتبار سے نہایت اہم اور نمایاں ہے ' وہ بحمد اللہ تنظیمِ اسلامی کی صورت میں موجود ہے! شرط صرف یہ ہے کہ خالی الذھن ہو کر ' اور قریب آ کر مشاہدہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ

اسی آزادیٔ اظہار رائے کا مظہر ہے کہ ہمارے بعض " مقربین " نے ہمارے کسی موقف پر اپنی " ذہنی ہل چل " کا اظہار صلاح الدین صاحب کے سامنے کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہ کی۔ اور متعدد رفقائے تنظیم نے نہایت تیز و تند تنقیدیں کراچی ہی کے اجتماع کے دوران خود مجھ پر اور مدیرِ 'ندا' پر کیں ــــــ مزید براں تنظیم کے ایک رفیق ' زبیر عمر صدیقی صاحب کی میری بعض آراء سے اختلاف پر مشتمل تحریر ہفت روزہ 'ندا' میں شائع ہوئی ہے۔)

اور اگرچہ یہ بحث محترم صلاح الدین صاحب سے تو براہ راست متعلق ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ کسی جماعت یا تنظیم میں شامل ہونے کے سرے سے قائل ہی نہیں (مبادا کبھی اس سے نکلنا پڑ جائے!) تاہم چونکہ انہوں نے ہمارے 'تذکرہ و تبصرہ' کے اس حصے سے متعلق بحث بھی چھیڑ دی ہے جس میں "تجھ سے تو کچھ کلام نہیں.....!" کے مصداق ان سے خطاب ہی نہ تھا ' لہٰذا اس کی کسی قدر 'وضاحت' ضروری ہو گئی ہے جس سے ' ان شاء اللہ العزیز ' اقامتِ دین کے لئے قائم ہونے والی جماعت کے نظم کی نوعیت کے اہم لیکن مشکل مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے تمام لوگوں کو فائدہ ہو گا۔

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ محترم صلاح الدین صاحب نے کس اصول کی بنیاد پر اور کس مقصد کے تحت ہمارے ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد کہ " جماعتِ اسلامی میں اظہارِ رائے کی آزادی ہاتھی کے اُن دانتوں کے مانند ہے جو دیکھنے میں تو بہت بڑے نظر آتے ہیں لیکن کھانے کے کام نہیں آ سکتے! " اس کے بعد کی پوری سولہ سطروں کا اقتباس تو درج فرما دیا لیکن پہلے کی وہ سات سطریں درج نہ کیں جن میں اس رائے کی دلیل پیش کی گئی تھی۔ یعنی :-

> "اس لئے کہ اجتماع ماچھی گوٹھ (فروری 1957ء) میں طے یہ پایا تھا کہ جو لوگ جماعت کی موجودہ پالیسی سے اختلاف رکھتے ہوں وہ اپنی رائے کا اظہار نہ

تحریری طور پر کر سکتے ہیں..... نہ زبانی طور پر'..... انہیں صرف جماعت کے کُل پاکستان اجتماعِ ارکان میں اظہارِ رائے کا حق حاصل ہوگا..... اس کے علاوہ نہ وہ جماعت کے مقامی یا حلقہ وار اجتماعات میں اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گے نہ ارکان جماعت سے نجی گفتگوؤں میں!..... اور ارکان کے کُل پاکستان اجتماع کے بارے میں نہ یہ یقینی ہوتا ہے کہ وہ کتنے وقفے کے بعد ہو سکے گا..... نہ ہی اس میں کسی اختلافی نقطۂ نظر کو تفصیلاً پیش کرنے کا موقع یا محل ہوتا ہے!".......

بہرصورت، اس موضوع پر دو اعتبارات سے گفتگو مناسب ہے۔ یعنی ایک اصولی اعتبار سے اور دوسرے واقعاتی اعتبار سے!

1۔ اصولی اعتبار سے راقم الحروف کی رائے اب بھی وہی ہے جس کا تحریری اور اعلانیہ اظہار سترہ سال قبل مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کے موقع پر اس کے مجوزہ دستور کے مسودہ کے ساتھ ضروری وضاحت کے طور پر کیا گیا تھا..... و ھو ھٰذا:

"دوسرا اعتراض جو اس جمہوریت نواز بلکہ جمہوریت پرست دور میں انجمن کے مجوّزہ خاکے کے بارے میں پیدا ہونا لازمی ہے یہ ہے کہ اس میں صدر مؤسّس کی حیثیت تحکمانہ ہی نہیں آمرانہ ہے۔ اس ضمن میں ہم اس اعتراف میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے نزدیک کسی دینی خدمت خصوصاً احیائی کوشش کے لئے جو بھی انجمن یا ادارہ وجود میں آئے یا جماعت یا تنظیم قائم ہو اس کا نظم اسی نوعیت کا ہونا چاہئے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اس طرح کی کسی بھی کوشش کا آغاز بالعموم اسی طرح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فرد کے دل میں اس کام کے لئے ایک شدید داعیہ بھی پیدا فرما دیتا ہے اور اس سلسلے میں موجود الوقت ظروف و احوال کی مناسبت سے اسے کسی خاص طریقِ کار اور منہجِ عمل کے لئے انشراحِ صدر بھی عطا فرما دیتا ہے' تب یہ فرد اس کام کو لے کر اٹھتا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف بلاتا ہے اور صلائے عام دیتا ہے کہ "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟"[1] چنانچہ جن لوگوں کو اس کے خیالات سے اتفاق اور خود اس پر شخصی اعتبار سے فی الجملہ اعتماد ہوتا ہے وہ اس کے

---

[1] سورۂ صف آیت نمبر 14 "کون ہے میرا مدد گار اللہ کی راہ میں!"

گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اسے آپ سے آپ ان لوگوں کی رہنمائی کا منصب حاصل ہو جاتا ہے۔

اب صاف اور سیدھی سی صورت یہی ہے کہ اس حقیقت کو خود بھی قبول کیا جائے اور اسی کا اعلانِ عام بھی ہو تاکہ جو بھی آئے اس صورت کو ذہناً قبول کر کے آئے اور بصورتِ دیگر اپنے لئے کوئی اور راہ تجویز کرے۔ یہی وجہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی تاریخ کے دوران میں جو احیائی کوششیں ہوئیں ان سب کا کم از کم 'تحریکِ شہیدینؒ' کے زمانے تک تو نظم یہی رہا ہے کہ ایک شخص بحیثیتِ داعی اٹھتا ہے اور جو لوگ اس کے گرد جمع ہوتے ہیں وہ آپ سے آپ ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ نہ کوئی شرائطِ رکنیت ہوتی ہیں نہ فارم داخلہ' نہ کہیں "پانچ سالہ" انتخاب کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے نہ ہی 'امیر' اور 'شوریٰ' کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لئے پیچ در پیچ فارمولے ایجاد کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی استعفیٰ یا 'اخراج' کے لئے کوئی ضابطہ بنایا جاتا ہے۔ بلکہ ایک شخص اپنے ذاتی احساسِ فرض کے تحت کام کا آغاز کر دیتا ہے۔ پھر جس جس کو اس کے خیالات سے اتفاق اور اس کی ذات پر اعتماد ہوتا ہے اس کا ساتھ دیتا رہتا ہے اور جونہی یہ دونوں —— یا ان میں سے کوئی ایک بات موجود نہیں رہتی اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنا راستہ لیتا ہے اور خواہ مخواہ "هَلْ لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ"[1] کے قسم کے قضیے کھڑے کرنے میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ وہ داعی اگر واقعی مخلص ہے اور خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے اور "وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا"[2] کا مصداق بننے کا شوقین نہیں تو اس کے لئے لازم ہے کہ جماعت میں شورائیت کا ماحول قائم رکھے۔ تاکہ اطمینان و اعتماد کی فضا برقرار رہے۔

ہم اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں ہمارا ذہن بالکل

---

[1] سورۂ آل عمران آیت نمبر 154 "اختیارات میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں!"

[2] سورۂ نحل آیت نمبر 92 "اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جس نے مضبوطی کے ساتھ کاتے ہوئے سوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا!"

یکسو ہے۔ ہم نے مجوزہ انجمن کے لئے قواعد و ضوابط کا یہ تھوڑا سا کھکھیڑ بھی صرف اس لئے مول لیا ہے کہ ایک تو یہ جماعت نہیں انجمن ہے اور دوسرے اس کی لامحالہ کچھ جائیداد بھی ہوگی جس کی تولیت کا معاملہ خالص قانونی ہے' ورنہ اگر خدا نے چاہا اور کسی ہمہ گیر دعوت کے آغاز کی توفیق بارگاہِ ربّ العزت سے ارزانی ہوگئی تو اس کا معاملہ انشاء اللہ خالصتاً اس نہج پر ہوگا جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے تعلیم و تعلّم قرآن کے جس کام کا علم اٹھایا ہے اس کی ابتداء بھی اسی فطری نہج پر ہوئی تھی کہ ایک شخص کے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا اور اسے کامل انشراح ہو گیا کہ فی الوقت "کرنے کا اصل کام" یہی ہے (کہ جا ایں جا است!) چنانچہ اس نے تن تنہا سفر کا آغاز کر دیا۔ تا آنکہ اب صورت یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کی نصرت پر کمرِ ہمت کس لی ہے۔ اس فطری صورتِ حال کو صرف موجود الوقت رجحانات کے دباؤ کے تحت 'جمہوری' رنگ دینا نہ صرف یہ کہ ایک خواہ مخواہ کا تکلف اور تصنّع ہے بلکہ خدشہ یہ ہے کہ اس طرح تمام وقت قواعد و ضوابط کی خانہ پُری اور حدود و اختیارات کی رسّہ کشی کے نذر ہو کے رہ جائے گا اور کام کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ بنابریں ہم نے وہی راستہ اختیار کیا ہے جو مطابقِ واقعہ بھی ہے اور کام کی مقدار اور رفتار کے اعتبار سے موزوں تر بھی! اللہ تعالیٰ ہمیں خلوص و اخلاص کی دولت عطا فرمائے اور ہمیں اپنے دین کی بالعموم اور اپنی کتابِ عزیز کی بالخصوص خدمت کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ خاکسار اسرار احمد۔"

الحمدللہ کہ ہمیں اپنی اس رائے کی صحت پر جس قدر اعتماد اس وقت تھا اس سے کم از کم دِہ چند انشراح اب حاصل ہے..... اس لئے کہ ہمارے نزدیک :

(ا) یہی طریقہ معقول اور منطقی بھی ہے' اور

(ب) سادہ اور فطری بھی'..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

(ج) مسنون و ماثور بھی ہے..... (بلکہ 'منصوص' بھی!)

اس سلسلے میں' ظاہر ہے کہ' ایسے لوگوں سے تو کوئی بحث ہی نہیں ہے جو (1) یا تو اقامتِ دین اور غلبۂ اسلام کی جدّوجہد کو دینی فریضہ ہی نہیں سمجھتے..... یا (2) اس جنّت الحمقاء

کے باسی ہیں کہ یہ کام محض تصنیف و تالیف یا تعلیم و تلقین یا دعوت و تبلیغ سے ہو جائے گا اور اس کے لئے نہ کوئی انقلابی جدّوجہد درکار ہے نہ کسی منظم ہیئتِ اجتماعیہ کے قیام کی ضرورت'..... یا (3) صرف آزاد صحافت ہی کو نہ صرف پیشے بلکہ اپنے جملہ قومی و ملی 'اور دینی و مذہبی فرائض کی ادائیگی کے کافی و خود مکتفی ذریعے کی حیثیت سے اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ہر وہ باشعور شخص جو اقامت دین کی جدّوجہد کو دینی فرائض میں شامل سمجھ کر اس کے لئے لازمی انقلابی جدوجہد کے منطقی تقاضوں پر غور کرے گا وہ لامحالہ اسی نتیجے پر پہنچے گا جو اوپر بیان ہوا ہے۔

2۔ واقعاتی اعتبار سے فی الوقت چند بار بار کی دہرائی ہوئی باتوں کی جانب صرف اشارہ کافی ہو گا :-

(1) بیسویں صدی عیسوی میں برِعظیم پاک و ہند میں تحریکِ اسلامی کے داعیِ اوّل تھے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جنہوں نے 1913ء میں بیعت کی بنیاد پر "حزب اللہ" قائم کی۔ (یہ دوسری بات ہے کہ 1920ء میں بعض اسباب کی بنا پر انہوں نے اپنا رخ تبدیل کر لیا جن کی تفصیل کی اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے)

(2) ان کے معنوی خلیفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم بھی اصلاً اسی کے قائل تھے جو ان کے اس خط سے ظاہر ہے جو انہوں نے مارچ 1941ء میں جماعت اسلامی کی تاسیس سے چھ ماہ قبل تحریر فرمایا تھا۔ (اور جو متعدد بار "میثاق" میں شائع کیا جا چکا ہے اور اس شمارے میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔)

(3) البتہ جماعتِ اسلامی کی تاسیس کے موقع پر بعض اسباب کی بنا پر (جن کی تفصیل میں جانا اس وقت ضروری نہیں ہے۔) مولانا مودودی نے جماعت کے لئے عملاً ایک دستوری ہیئت اختیار کی۔ لیکن اُن کا مستقل موقف ہمیشہ یہ رہا کہ امیرِ جماعت کو شوریٰ کی اکثریت کے مقابلے میں حقِ استرداد (ویٹو) حاصل ہونا چاہئے جس کو اگر بالفعل اختیار کر لیا جاتا تو صورت 'دستوری بیعت' ہی کی بن جاتی..... لیکن مولانا امین احسن اصلاحی کی شدید مخالفت و مزاحمت کے باعث ایسا نہ ہوا بلکہ عملاً صورت یہ رہی کہ دستوری اور قانونی طور پر تو جماعت میں امیرِ جماعت اور شوریٰ کے مابین اختیارات کی تقسیم کے لئے پیچ در پیچ فارمولا زینتِ آئین بنا رہا لیکن عملاً مولانا مودودی جماعت کی پالیسی کو اپنی صوابدید کے مطابق چلاتے رہے جس پر شوریٰ کو اکثر و بیشتر صرف اس لئے صاد کرنا پڑتا تھا کہ امیرِ جماعت پبلک

میں ایک موقف اختیار کر چکے ہیں۔

(4) جماعت کی پوری تاریخ میں صرف ایک بار (دسمبر 56ء میں) جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے موقف پر اصرار کیا..... تو یہی بات "نقضِ غزل" یعنی جماعت کی پوری عمارت میں ایک زبردست توڑ پھوڑ کا سبب بن گئی۔ جس کے حقائق و واقعات کو افادۂ عوام کے لئے منظرِ عام پر لانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ (اگرچہ گزشتہ پرچے کے اعلان کے مطابق اسے 'میثاق' میں بالاقساط نہیں شائع کیا جا رہا بلکہ عنقریب یکجا کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔ تاکہ وہ تلخ بلکہ 'گھناؤنے' واقعات صرف ان ہی لوگوں کے علم میں آئیں جو علمی اور تحقیقی دلچسپی رکھتے ہوں۔ اور ان کی روشنی میں 'اقامتِ دین کے لئے قائم ہونے والی جماعت کی ہیئتِ تنظیمی' کے مسئلے میں آئندہ کے لئے رہنمائی اخذ کرنا چاہیں۔)

(5) فروری 1957ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں مولانا مودودی نے ارکان جماعت سے جو بالواسطہ اختیار (MANDATE) حاصل کیا تھا اسے بروئے کار لاتے ہوئے جب انہوں نے دستورِ جماعت میں ترمیم کی۔ اور دسمبر 1957ء یا جنوری 1958ء میں کوٹ شیر سنگھ کے اجتماعِ شوریٰ میں اس موضوع پر اپنی اصل اور قدیم رائے کو ایک مفصّل اور مدلّل تقریر کی صورت میں پیش کیا تو مولانا اصلاحی خاموشی کے ساتھ اس اجلاس سے اٹھے اور سیدھے لاہور آ گئے..... اور جماعت اسلامی کی رکنیت سے استعفاء دے دیا۔ اس پر جو خطو کتابت ان کے اور مولانا مودودی کے مابین ہوئی وہ ہفت روزہ 'ندا' میں شائع ہو گئی ہے جس میں عبرت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھنے والے لوگوں کے لئے رہنمائی کا بہت سا سامان موجود ہے۔ فاعتبروا یااولی الابصار!

اس مرحلے پر راقم ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کر دینا چاہتا ہے کہ اگرچہ وہ بحمداللہ ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہے جو ہر معاملے میں مولانا مودودی مرحوم کو حرفِ آخر قرار دیتے ہوں..... بلکہ اس کا شمار مولانا مرحوم کے شدید ترین ناقدین میں ہوتا ہے..... تاہم اس معاملے میں اسے ان کی رائے سے صدفی صد اتفاق ہے۔ بلکہ اسے شدید رنج ہے کہ چونکہ جماعت اسلامی نے جماعت کی رودادوں کی طباعت کا سلسلہ ہی بند کر دیا۔ لہٰذا مولانا مودودی مرحوم کی کوٹ شیر سنگھ والی تقریر بھی تاریخ کے اوراق میں گم ہو کر رہ گئی۔ ورنہ اس میں اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لئے قائم ہونے والی جماعت کی ہیئتِ تنظیمی کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کو غور و فکر کا بہت سا مواد ملتا..... (قطع نظر اس سے کہ کوئی مولانا کی رائے

سے اتفاق کرتا یا اختلاف!)

راقم نے چونکہ اپریل 57ء ہی میں جماعت سے علیٰحدگی اختیار کر لی تھی لہٰذا اسے تو اس تقریر تک براہِ راست رسائی حاصل نہ تھی' تاہم اس کا جو لبِّ لباب مختلف واسطوں اور ذریعوں سے اس تک پہنچا اس کا حاصل یہ ہے کہ 'حکومت اور مملکت کی سطح پر مطلوبہ جمہوریت اور شورائیت کا معاملہ جدا ہے..... اور جماعت اور تحریک' بالخصوص انقلابی تحریک' جس نوعیت اور طرز کی جمہوریت اور شورائیت کی متقاضی ہے اس کا معاملہ علیٰحدہ ہے۔ چنانچہ ان دونوں کے مابین بہت سے دوسرے مابہ الاختلاف امور کے علاوہ ایک اہم فرق یہ ہے کہ 'حکومت' کی عملداری (JURISDICTION) ایک علاقے پر ہوتی ہے اور اس میں رہنے والے سب لوگ اس میں لامحالہ شریک ہوتے ہیں جبکہ 'جماعت' کی کوئی علاقائی عملداری نہیں ہوتی اور کوئی انسان جب چاہے کسی جماعت میں شامل اور جب چاہے اس سے علیٰحدہ ہو سکتا ہے' لہٰذا ان دونوں میں خلطِ مبحث درست نہیں ہے!" ..... راقم کو یقین کی حد تک وثوق حاصل ہے کہ مولانا مرحوم کی تقریر کا مرکزی خیال (THEME) یہی تھا..... تاہم اکتیس بتیس سال قبل کی 'شنید' میں غلطی کا احتمال موجود ہے..... اور راقم کی درخواست جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے یہ ہے کہ اگر یہ علمی امانت کہیں دستیاب ہو سکتی ہو تو اسے ضرور شائع کر دیا جائے..... بہرحال راقم کو مولانا مرحوم کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے..... اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے اس بندۂ ضعیف کو اتنی ہمت عطا فرمائی کہ اس نے جیسے ہی تنظیم کی جانب پہلا قدم بڑھایا اور انجمن قائم کی اپنی اس رائے کو ڈنکے کی چوٹ بیان کر دیا۔ اور اس میں ہرگز کوئی جھجک محسوس نہ کی!..... اور یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ آج تک نہ انجمن میں کوئی اکھیڑ پچھاڑ ہوئی ہے' نہ تنظیم ہی میں کوئی زلزلہ آیا ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ!"

اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لئے قائم ہونے والی جماعت اور نظامِ بیعت کا معاملہ تو' جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے محترم صلاح الدین صاحب سے متعلق ہے ہی نہیں۔ (اگرچہ ہماری دعا ہے کہ یہ صورتِ حال بدل جائے اور وہ بھی اقامتِ دین کے لئے اجتماعی اور منظم جدّوجہد کی اہمیت و مشروعیت کے پورے شعور و ادراک کے ساتھ اس مقصد کے لئے کسی چلتے ہوئے قافلے کو تلاش کریں یا پھر خود کوئی قافلہ ترتیب دینے کی کوشش کریں۔ وَما ذالک

علی اللہ بعز یز!) ۔ انہوں نے خواہ مخواہ ہم سے حقِ اختلاف طلب کرتے ہوئے یہ بحث چھیڑ دی کہ میں نے کوئی تم سے بیعت تو نہیں کی ہوئی ہے کہ تم سے اختلاف نہ کروں' جس کی وجہ سے ہمیں اس وقت اس مسئلے پر بحث کرنا پڑی۔ اللہ کرے کہ ہماری ان مفصّل گزارشات سے ان کا یہ مغالطہ رفع ہو جائے کہ بیعت سے حقِ اختلاف' یا رائے اور اس کے اظہار کی آزادی سلب نہیں ہوتی۔ تاہم ان سے تو اصل گزارش یہ ہے کہ آپ سے یہ حقِ اختلاف چھین کون سکتا ہے؟ یا ہم نے کب اس کی کوشش کی؟..... لیکن کیا اس حقِ اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ صریح کذب وافتراء اور بے بنیاد الزام تراشی اور بہتان طرازی پر بھی گرفت نہ کی جائے؟؟

محترم صلاح الدین صاحب! یہ انداز و اسلوب کہ مخاطب کی اصل بات کا تو جواب ہی نہ دیا جائے اور غیر متعلق باتوں پر صفحے کے صفحے سیاہ کر کے قارئین کے ذہن کو تھکا اور الجھا دیا جائے بے اصول اور دنیا دار صحافت کا تو شاہکار ہو سکتا ہے..... لیکن "ایں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را!"

اسی طرح ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں ایک خاص علاقے سے منسوب مصنوعی آداب اور رکھ رکھاؤ سے مناسبت نہیں ہے ——— اس لئے کہ اگرچہ ہمارا خمیر تو اسی علاقے کی مٹی سے اٹھا تھا جہاں سے خود آں محترم کا لیکن اب ہمیں پنجاب کے مرکز میں رہتے چالیس سال کا عرصہ بیت چکا ہے' لہٰذا ہم بات صاف اور ڈنکے کی چوٹ کرنے کے عادی ہیں' خواہ دوسرے اسے 'لٹھ مار' انداز ہی قرار دیں..... چنانچہ ہم اس اعتراف کے ساتھ کہ ہم نے سخت زبان استعمال کی' اس نوع کی معذرت کرنے کو تیار نہیں کہ 'بات تو میں نے صدفی صد ٹھیک ہی کہی تھی لیکن اگر آپ کو (گویا اپنی کم ظرفی کے باعث) اس سے تکلیف پہنچی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں!' ..... بلکہ ہمیں اصرار ہے کہ ہمیں اس سخت کلامی کا اخلاقی اور شرعی حق حاصل ہے" بفحوائے الفاظ قرآنی۔" لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (سورۃ النساء۔ 148) اور "وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ○ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ..... " (سورۃ الشوریٰ آیات 41 - 42) اور ہمارا موقف یہ ہے کہ ہم پر ظلم ہوا ہے' ہماری عزت پر حملہ کیا گیا ہے' اور ہم پر بہتان طرازی کی گئی ہے!

صلاح الدین صاحب نے اگر اجتہاد کی بحث سے 'غضِ بصر' کیا تو یہ قابلِ فہم بھی ہے

اور ایک پہلو سے خوش آئند بھی۔ لیکن ہم نے ان پر جو فردِ جرم عائد کی ہے اس سے صرفِ نظر' کسی طرح درست نہیں ہے..... اس لئے کہ ہم نے ان پر الزام یہ عائد کیا تھا کہ :

"انہوں نے میری ہجو ملیح اور کردار کشی میں اپنی جملہ صحافیانہ صلاحیتوں اور اظہار وبیان کی تمام استعدادات کے ساتھ افتراء اور بہتان سے بھی گریز نہیں کیا۔"

اور اس کی وضاحت میں جو کچھ تحریر کیا تھا اسے غیر ضروری تفصیلات حذف کر کے دوبارہ پیش کیا جارہا ہے۔ (پوری عبارت کے لئے دیکھئے 'میثاق' فروری 89ء صفحہ 82 تا 84)

"انہوں نے میرے خلاف اپنے اس قلمی جہاد کی بنیاد بن تین الزامات پر استوار کی ہے ان میں سے ایک کے بارے میں تو میں یہ گمان کر سکتا ہوں کہ انہوں نے میرا موقف صحیح طور پر سمجھا نہ ہو اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہوں' لیکن بقیہ دو تو بدیہی طور پر خالص افتراء اور بہتان پر مبنی ہیں! اور ان کے ضمن میں ان کی بدنیتی اظہر من الشمس ہے!

نیک نیتی کے ساتھ مغالطہ صرف اس معاملے میں ہو سکتا ہے کہ میں اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ کے انتخاب کے لئے رائے دینے کا حق' اور اس کے لئے امیدواری کی اہلیت کی اساسی شرط صرف "اسلام" کو سمجھتا ہوں..... تاہم اس معاملے میں بھی مدیر 'تکبیر' کی نیک نیتی صرف اسی اساس پر تسلیم کی جا سکتی ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ وہ مجلس کے خاص حالات میں..... میری وضاحتوں پر کان ہی نہ دھر سکے! اس لئے کہ میں نے وضاحت کر دی تھی کہ اضافی شرائط کے ضمن میں جیسے ووٹر کی عمر کا معاملہ ہے' جو مختلف جمہوری ممالک میں مختلف ہے اسی طرح تعلیم اور کردار کی اضافی شرائط بھی عائد کی جا سکتی ہیں.....

اسی طرح یہ الزام کہ میں "اہلِ دین کو قانون ساز اداروں سے دور" رکھنا چاہتا ہوں ایک صریح بہتان ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کے آخری سوال کے جواب میں میں نے شدید حیرت اور تعجب کے ساتھ پوری وضاحت سے ان کے اس الزام سے برأت کا اظہار کر دیا تھا.....

رہی تیسری بات..... یعنی "عورت کو اسلامی ریاست اور حکومت کی سربراہی کا اہل ٹھہرانے اور اس کے لئے ستر و حجاب اور دائرہ کار کی تمام حدود

ساقط کر دینے" کا الزام تو اس پر تو بے ساختہ سورۂ مریم کے آخر میں وارد شدہ الفاظِ مبارکہ نوکِ قلم پر آگئے ہیں۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ○ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ○ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ماہ سے بھی کم عرصہ قبل اپنی ایک تحریر میں دو مرتبہ یہ شہادت دینے کے بعد کہ میں عورت کی سربراہی کو "منکر" سمجھتا ہوں لیکن موجودہ حالات میں قومی و ملکی مصلحتوں کے پیشِ نظر دوسرے بہت سے منکرات کی طرح اسے بھی مجبوراً صرف گوارا کرنے کا قائل ہوں..... اور خود بھی اسی موقف کی تائید کرنے کے بعد..... مدیر تکبیر کی نظر سے میرا وہ کون سا فتویٰ گزرا ہے جس کی بناء پر انہوں نے اتنا بڑا الزام لگا دیا اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس افتراء اور کذبِ صریح پر سب و شتم کے بگٹٹ گھوڑے دوڑانے میں اپنی طلاقتِ لسانی اور شوخ بیانی کی پوری صلاحیت و استعداد صرف کر دی۔"

ہماری اس "فردِ جرم" کے جواب میں صلاح الدین صاحب کے لئے واحد معقول روش یہ تھی کہ یا تو اس کی تردید کرتے..... اور اپنے تینوں الزامات کے ثبوت فراہم کرتے، ورنہ شرافت کے ساتھ اپنی غلطی تسلیم کر کے وہ طرزِ عمل اختیار کرتے جو ہم نے تجویز کیا تھا یعنی:

"ان کے لئے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بھی استغفار کریں اور ان سطور کے عاجز راقم سے بھی علیٰ رءوس الاشہاد معافی مانگیں۔ اس پر وہ اللہ تعالیٰ کو بھی تواب اور رحیم پائیں گے..... اور ان شاء اللہ اس ناچیز کو بھی اپنا پہلے ہی جیسا نیاز مند پائیں گے..... ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ"

لیکن انہوں نے نہ پہلا طرزِ عمل اختیار کیا نہ دوسرا، بلکہ گفتگو کو غیر متعلق گوشوں میں الجھا کر، بالآخر معذرت طلب بھی کی تھی تو اسی انداز کی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے..... یعنی:

"ڈاکٹر صاحب کے جذبات و احساسات کو جو ٹھیس میری تحریر سے پہنچی ہے اس پر مکرّر معذرت، ہزار بار معذرت، اور اللہ سے مغفرت و اصلاح کی عاجزانہ دعا..... مگر میں اپنے علمی موقف پر قائم ہوں، اس پر کسی معذرت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا!"

اس پر ہماری گزارش یہ ہے کہ جناب! آپ کا علمی موقف آپ کو مبارک، ہم دعا کرتے ہیں

کہ اگر اس میں کوئی غلطی ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس پر متنبہ ہونے اور اصلاح کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور اگر وہ صحیح ہے تو وہ تم آپ کو اس پر استقامت عطا فرمائے...... رہا آپ کے ساتھ علمی مباحثہ و مناظرہ تو اس کا اہل ہم نے اپنے آپ کو تو کبھی سمجھا ہی نہیں، تکلف برطرف، آپ کے علم و فہم کا معاملہ بھی "سخن فہمیٔ عالمِ بالا معلوم شد!" کا نقشہ پیش کر رہا ہے...... ہمارا اور آپ کا معاملہ ایک سیدھے سادھے مقدمہ کا ہے اور اس کے بارے میں صحیح روش وہی ہے جو اوپر دوبارہ عرض کر دی گئی یعنی یا چناں کن یا چنیں! بصورتِ دیگر ہم سے اس قسم کی سخن سازی کی توقع نہ رکھیے کہ :

> "ڈاکٹر صاحب سے قلب و ذہن کا رشتہ عقیدت و محبت کی جس سطح پر پہلے تھا، خدا گواہ ہے، میثاق کے مطالعہ کے بعد بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ میں نے اپنی طبیعت میں نہ کوئی انقباض محسوس کیا نہ تکدّر!" ......
>
> "میں انشاء اللہ آئندہ بھی ان سے محبت و تعاون کا وہی رشتہ برقرار رکھوں گا، جو ماضی میں ان سے رہا ہے۔"

اور اس کے بعد آپ نے جو فرمایا ہے کہ "گریز یا التفات خود ان پر منحصر ہے۔" تو ہمارا جواب صاف سن لیجئے کہ اگر آپ اپنی غلطی پر واقعی دلی پشیمانی کے ساتھ (جس کا جج مظلوم ہوتا ہے نہ کہ ظالم) ایک لفظ میں معذرت خواہ ہوں گے تو ہم "التفات" کیا معنی سر کے بل آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے...... اور اگر آپ اپنی اسی روش پر قائم رہے جو آپ کی اب تک کی تحریروں میں سامنے آئی ہے تو ہم "گریز" ہی نہیں "اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ" پر عمل کرنے پر مجبور ہوں گے۔ !

اور جناب مدیر 'تکبیر' کے علاوہ قارئینِ 'میثاق' بھی نوٹ فرما لیں کہ اگر 'تکبیر' کی جانب سے آئندہ بھی اسی انداز پر بات بڑھانے کی کوشش ہوئی تو ہماری جانب سے آج کی معروضات آخری ہونگی —— آئندہ قارئین خود ہی اپنی سمجھ بوجھ سے کام لیں، ہماری جانب سے نہ کوئی 'جواب' ہوگا نہ وضاحت!

مدیر 'تکبیر' محترم صلاح الدین صاحب سے ہماری براہ راست گفتگو اصولاً تو اس مقام پر ختم ہو جاتی ہے' تاہم چونکہ انہوں نے ہمارے سابقہ 'تذکرہ و تبصرہ' کو بجا طور پر 'پوسٹ مارٹم' سے تعبیر کیا ہے' لہٰذا ہم اپنی طبیعت پر جبر کر کے ان کی حالیہ تحریر کے بعض 'تسامحات' کی نشاندہی بھی کئے دیتے ہیں۔

1۔ محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے خط اور اس کے جواب کے ضمن میں مدیر 'تکبیر' کی تحریر سے یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید ہم نے جان بوجھ کر نہ ان کا جواب شائع کیا اور نہ انہیں ٹیپ فراہم کیا' ان کا ارشاد ہے: "جواب میں نے 22 رجنوری کو انہیں دستی طور پر پہنچا دیا تھا۔ میرا جواب کسی وجہ سے شاملِ اشاعت نہ ہو سکا!" ..... اور "مجھے افسوس ہے کہ محترم جمیل الرحمٰن صاحب میری درخواست کے باوجود ٹیپ مجھے فراہم نہ کر سکے!" ..... حالانکہ یہ واقعات اتفاقاً لیکن تفصیلاً 'تذکرہ و تبصرہ' میں درج کر دیئے گئے تھے کہ شیخ صاحب موصوف 19 ر کو بغرضِ عمرہ حجاز روانہ ہو چکے تھے..... اور "ان سطور (گزشتہ تذکرہ و تبصرہ) کی تحریر کے وقت تک وہ ارضِ مقدس ہی میں مقیم ہیں!" ..... اب سوال یہ ہے کہ مدیر 'تکبیر' کا جواب' اور ٹیپ کی فرمائش ہمارے علم میں آتی تو کیسے؟ اور ان کا خط "شرفِ اشاعت" پاتا تو کس طرح؟ پھر کیا محترم مدیر 'تکبیر' کی تنظیم اسلامی کراچی کے کسی بھی رفیق سے اتنی بھی شناسائی نہیں کہ وہ فون کر کے ٹیپ طلب فرما لیتے؟ (برادرم قاضی عبدالقادر صاحب سے تو ان کی بہت پرانی راہ و رسم ہے ہی' سید سراج الحق صاحب امیر تنظیم اسلامی کراچی و صدر انجمن خدام القرآن سندھ کا ذکر خود 'تکبیر' کی اس تحریر میں موجود ہے!) اب ع "کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا!"

2۔ ارشاد ہوا ہے: "جو سوا دو گھنٹے کی تقریر کے بعد اپنے ہی مدعو کردہ سوال کنندگان کو مجموعی طور پر 15 منٹ بھی دینے کو تیار نہیں!" حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تقریر کے بعد سوال جواب نصف گھنٹے پر محیط تھے..... اور صرف مدیر 'تکبیر' نے 14 منٹ لئے تھے!

3۔ مدیر 'تکبیر' کے باقاعدہ سونے کی روایت ہم نے چشم دید گواہوں کے حوالے سے پیش کی تھی۔ میری تو ان کی جانب پیٹھ تھی۔ وہ فرمائیں گے تو بعض گواہوں کے نام بھی پیش کر دیئے جائیں گے!

4۔ ارشاد ہوا ہے: "میں الحمدللہ نہ دل گرفتگی میں کبھی مبتلا ہوتا ہوں نہ....." مدیر 'تکبیر' کا یہ 'تکبر' ان ہی کو مبارک ہو۔ ہم نے تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی

صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خطاب بھی پڑھا ہے: "وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ" ترجمہ۔ "ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے' اور ہمیں تسلیم ہے کہ ہمیں تو مدیر 'تکبیر' کی اس کردار کشی کی مہم سے بہت تکلیف پہنچی ہے جو انہوں نے ہمارے خلاف شروع کی ہے!

رہا ہمارا اور مولانا مودودی مرحوم کا حالیہ یا سابقہ تعلق' اور ایک جانب ہمارے اور جماعت اسلامی اور اس کی موجودہ قیادت اور دوسری جانب ہمارے اور سابقہ وابستگان و رہنمایان جماعت کے 'دو طرفہ تعلقات' کا معاملہ تو اس سے مدیر 'تکبیر' کو کیا غرض؟ _____ انہیں تو اس پر فخر ہے کہ ہم "جہاں سے نکلے" انہوں نے "وہاں قدم ہی نہیں رکھا" ..... تو انہیں کیا پتہ کہ ع "لذتِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی!" کے مصداق اس وصل و فراق میں کیا لذت ہے! _____ ہم انہیں بالکل معذور سمجھتے ہیں اگر وہ ہمارے اور مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے تعلق کے ضمن میں ہماری اُن قلبی کیفیات کا اندازہ نہ کر پائیں جن کے اظہار و بیان کے لئے ہم نے مختلف مواقع پر ان اشعار کا سہارا لیا ہے کہ:

ے گزشتہ منزلیں منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر یہ خلش دل کی بآسانی نہیں جاتی!
ے میں کہ مری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!
ے تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے یہ نسبت اور محکم ہو گئی!

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے گزشتہ ماہ کے 'تذکرہ و تبصرہ' کا وہ آخری حصہ بھی درج کر دیں جو مضمون کے بے حد طویل ہو جانے کے باعث روک لیا گیا تھا اور جس کی معنویت اور ضرورت و اہمیت اب مزید نکھر کر سامنے آئے گی۔ و ھو ھذا:

"یہ تحریر اگرچہ بہت زیادہ طوالت اختیار کر گئی ہے لیکن اس کے خاتمے سے قبل اُس

سوال کا جواب دینا اشد ضروری ہے جو اکثر و بیشتر قارئین کے ذہنوں میں لازماً پیدا ہو گا۔ یعنی یہ کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کے تحت محترم صلاح الدین صاحب نے میرے خلاف اس 'صلیبی جنگ' کا آغاز کیا اور اس کے سلسلے میں اتنا نیچے اُتر آئے کہ اِفترا اور بہتان سے بھی دریغ نہ کیا؟ یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ وہ ایک عام صحافی نہیں' ملک کی مذہبی صحافت کے قافلہ سالاروں میں سے ہیں (بلکہ فی الوقت انہیں سالارِ اوّل قرار دیا جائے تو بھی غلط نہ ہو گا) ۔ پھر وہ ایک معروف دانشور اور منجھے ہوئے مصنف و مقرر بھی ہیں۔ مزید برآں وہ گہرے مذہبی مزاج کے حامل بھی ہیں اور اسلام اور پاکستان دونوں کے ساتھ ان کی وابستگی اور کمٹ منٹ کی گہرائی و گیرائی دونوں مسلّم ہیں! پھر ان تمام بلندیوں کے ساتھ یہ پستی آخر کس بنا پر؟..... اس سوال کے جواب کے ضمن میں یہ تو اس سے قبل عرض کیا ہی جا چکا ہے کہ اس کا حتمی اور یقینی علم سوائے عالم الغیب والشّہادۃ کے اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا تاہم قرائن و شواہد کی بنیاد پر ایک اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے بھی بحمداللہ کسی فنی تحلیلِ نفسی کی کوئی حاجت نہیں..... ذرا سا تاریخی اور واقعاتی پس منظر میں جھانکنا کافی ہو گا۔

واقعہ یہ ہے کہ میرے اور ان کے درمیان ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہم دونوں کا حالیہ یا سابقہ..... اور باضابطہ یا بے ضابطہ تعلق تحریک جماعتِ اسلامی سے ہے۔ اور ہم دونوں کے ذہن اور مزاج کی تشکیل میں جماعتِ اسلامی کا بڑا حصّہ ہے..... صرف اس فرق کے ساتھ کہ میں نے تحریک اسلامی سے اُس وقت اثر قبول کیا جب اس پر انقلابی رنگ غالب تھا..... اور ان کے ذہن و مزاج کی صورت گری اس وقت ہوئی جب جماعت پر سیاسی رنگ فیصلہ کُن حد تک غالب آ چکا تھا۔

چنانچہ میں نے تحریکِ اسلامی سے جو اساسی اور اہم ترین سبق سیکھا وہ یہ ہے کہ اگرچہ اسلام کا اوّلین تقاضا تو ہر مسلمان سے یہی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بے چون و چرا اطاعت کو اپنی حیاتِ دنیوی کا دستور و لائحہ عمل اور عبادتِ ربّ کو اپنی زندگی کا اصل حاصل قرار دے..... لیکن اس پر بس نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد اتنا ہی شدید تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلام کی شہادت و اقامت کی جدّوجہد میں تن' من' دھن' لگا دے اور اس کے لازمی تقاضے کے طور پر اس مقصد کے لئے قائم ہونے والی کسی جماعت میں اُس کے نظم کی پابندی کو دل و جان سے قبول کرتے ہوئے شمولیت اختیار کرے! یہی وجہ ہے کہ جب میں دس سال تک اسلامی جمعیتِ طلبہ اور جماعتِ اسلامی کے نظم سے وابستہ رہنے کے بعد طریقِ کار کے اختلاف کی بناء

پر علیحدہ ہوا تو کئی سال لاہور' لائلپور' رحیم یار خاں' رحیم آباد' سکھر اور کراچی میں بعض بزرگوں کے کوچوں کا طواف کرتا رہا کہ کسی طرح ان میں سے کوئی کمرِ ہمت کس لے اور ایک نئی اجتماعیت کی بنیاد رکھ دے..... اور جب ان سب سے مایوسی ہوئی تو تن تنہا ایک نئی تعمیر کے لئے سامان جمع کرنے میں لگ گیا اور بالآخر تنظیم اسلامی کے نام سے' ایک قافلہ تشکیل دے لیا..... اور اپنی صوابدید کے مطابق اُسی انقلابی راستے پر از سرِ نو سفر کا آغاز کر دیا جس سے انحراف کا الزام لگا کر ہم سب نے جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی۔

اس کے بالکل برعکس معاملہ رہا محترم محمد صلاح الدین کا۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ وہ ایک طویل عرصے تک جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ 'جسارت' کراچی کے چیف ایڈیٹر رہے اور اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک' خواص اور عوام سب کے نزدیک جماعت کے 'رہنماؤں' میں شمار ہوتے رہے انہوں نے اس کی رکنیت کبھی اختیار نہیں کی۔ اور اس کے ڈسپلن کی پابندی کو اپنے مرتبہ و مقام سے فروتر سمجھا۔ (ایک روایت کے مطابق مولانا مودودی مرحوم نے انہیں یہ پیشکش بھی کی تھی کہ ہم آپ کو رکنیت کی امیدواری کے طویل اور صبر آزما مراحل سے نہیں گزاریں گے بلکہ آپ درخواست دیں تو فوراً ہی رکن بنا لئے جائیں گے' لیکن انہوں نے اسے بھی قبول نہیں کیا)

لیکن افسوس کہ اس آزادی اور آزاد خیالی کے باوجود انہوں نے جماعت اسلامی کے سیاسی فکر اور مزاج کو دلی آمادگی کے ساتھ قبول اور اختیار کر لیا اور اس کے ایجاد کردہ مخصوص پروپیگنڈہ تکنیک میں مہارتِ تامّہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ایک خاص وصف کو تو اپنی شخصیت میں اس طرح جذب کر لیا کہ وہ اُن کی طبعیتِ ثانیہ بن گیا..... اور وہ یہ کہ ہر دور میں کسی خاص شخصیت یا گروہ کو تمام خرابیوں کا اصل سبب اور جملہ قومی و ملکی مسائل و مشکلات اور دینی و اخلاقی عوارض کی واحد علّت العلل قرار دے کر اس پر مسلسل جارحانہ تنقید کی جائے اور اسے عوامی نفرت و ملامت کا ہدف بنا دیا جائے' اور اس طرح پوری قوم نہ سہی' کم از کم اپنے کارکنوں کے لسانی و قلمی جہاد کو ایک خاص رخ پر مرتکز رکھا جائے..... تاکہ ایک جانب ان کا لہو گرم رہے اور دوسری جانب انہیں حقائق و واقعات کے وسیع تر تناظر میں مشاہدے کی فرصت ہی نہ ملے!۔

اس غرض کے لئے اوّلاً بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن جب وہ قضائے الٰہی سے جلد ہی منظر سے ہٹ گئے تو دوسرے نمبر پر توپوں کا رخ قائد ملّت

خان لیاقت علی خاں کی جانب پھیر دیا گیا..... لیکن جب وہ بھی دفعتاً منظر سے ہٹا دیئے گئے تو پھر مجبوراً "برسر اقتدار طبقہ" کی اصطلاح سے کام لیا گیا۔ تاہم یہ ٹارگٹ مبہم تھا جس پر چاند ماری میں دِقت ہو رہی تھی..... لیکن جلد ہی سابق صدر ایوب خاں نے ساری کمی پوری کر دی..... اور چونکہ ان کی قوت کا اصل سرچشمہ یعنی فوج تو برسرِعام تنقید کا ہدف نہیں بنائی جا سکتی تھی لہٰذا اب ساری خرابیوں کی جڑ اور گویا بس کی گانٹھ صرف ان کی ذات قرار پائی..... چنانچہ مسلسل گیارہ برس تک قوم کو باور کرایا گیا کہ پاکستان کے جملہ مذہبی و اخلاقی، سماجی و معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی، سیاسی و ملی، معاشی و اقتصادی حتیٰ کہ جملہ انتظامی عوارض و امراض کا واحد سبب یہ شخص ہے..... اور جملہ مسائل و مشکلات کا حل صرف اس میں مضمر ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس شخص کو مسندِ اقتدار سے علیٰحدہ کر دیا جائے..... اگر ایسا ہو جائے تو سب کچھ خود بخود درست ہو جائے گا!..... پھر جب صدر ایوب خاں بھی اقتدار سے علیٰحدہ ہو گئے اور حالات سُدھرنے کی بجائے خراب سے خراب تر ہوتے گئے تو اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کی بجائے ؎

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

کے مصداق فوراً ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کو ٹارگٹ بنا لیا گیا اور پورے سات آٹھ برس تک ان ہی کو تمام خرابیوں کا سبب، تمام بیماریوں کی جڑ، اور جملہ مسائل و مشکلات کی علّت العلل قرار دیا جاتا رہا!

اس آخری دور میں جماعت اسلامی کے سب سے بڑے نفسِ ناطقہ محمد صلاح الدین صاحب تھے، اس لئے کہ مولانا مودودی مرحوم ضعیفی اور علالت کے باعث غیر مؤثر اور تحریر و تقریر سے معذور ہو چکے تھے..... اور نئے امیرِ جماعت میاں طفیل محمد صاحب سمیت جماعت کی پوری قیادتِ عظمیٰ میں کوئی قلم کا دھنی اور سیاسی تجزیہ و تبصرہ نگار موجود نہ تھا، لہٰذا اس نئے ٹارگٹ پر گولے برسانے کا کام سب سے زیادہ صلاح الدین صاحب ہی نے کیا۔ اور رفتہ رفتہ صورت یہ بن گئی کہ جو باتیں جماعتی مصلحت اور وقتی سیاسی ضرورت کے تحت بار بار کہنی اور لکھنی پڑ رہی تھیں وہ خود اُن کے تحت الشعور میں اس حد تک رچ بس گئیں کہ بھٹو سے نفرت اور پیپلز پارٹی کی دشمنی ان کے مزاج کا جزوِ لاینفک بن کر رہ گئی۔

صلاح الدین صاحب تو ایک 'فرد' تھے، تنظیمی ڈسپلن سے یکسر آزاد، اور جماعتی و تحریکی مصالح سے قطعاً لاتعلق، لہٰذا انہیں تو ایک خاص سمت میں مسلسل اور بلا تکان اڑان جاری

رکھنے میں کوئی دقت نہ تھی..... لیکن جماعت آخر 'جماعت' تھی' اور اس کے قائدین کو اپنے کارکنوں کو بھی مطمئن کرنا پڑتا تھا..... پھر ربع صدی قبل سے وہ ایک خالص سیاسی جماعت کا رول اختیار کر چکی تھی جس کے لئے کسی 'اصول پرستی' کے کھونٹے سے بندھا رہنا' بالخصوص پاکستان کے معروضی حالات میں' خودکشی کے مترادف ہوتا' لہٰذا اس پر تو ؏ "کہ صبح وشام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں"! - اور..... ؏ "جب تک شراب آئی کئی دور چل گئے!" کے مصداق کئی دور آئے اور گزر گئے چنانچہ 'سیاست کے میدان میں نہ کوئی دوستی مستقل ہوتی ہے' نہ دشمنی!' کے مطابق پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی کے مابین تعلقات میں بھی قُرب و بُعد اور دوستی اور دشمنی کے کئی دور آئے..... نتیجتاً ان کے دوران جماعتِ اسلامی کی قیادت اور محترم صلاح الدین صاحب کے مابین تعلقات میں بھی اتار چڑھاؤ کا عمل جاری رہا۔

۷۷ء کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اوّلاً جماعت اسلامی نے ضیاءالحق مرحوم کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اور مارشل لاء کی چھتری کے تحت وزارتیں تک قبول کرلیں۔ اس پر کچھ عرصہ تک تو جماعت کے عام کارکنوں پر ایک سرور آمیز اطمینان اور کیف آور اُمید کی کیفیت طاری رہی..... اور وہ کچھ ایسے محسوس کرتے رہے جیسے ؏..... "اس موڑ سے آگے منزل ہے' مایوس نہ ہو دڑاتا جا!" .....

لیکن جب وزراءِ جماعت بیک بینی و دو گوش ایوانِ اقتدار سے نکال باہر کئے گئے اور جماعت گویا ایک دم آسمان سے زمین پر آرہی تو کارکنوں کو بھی ہوش آیا کہ یہ ہم کس سراب کے دھوکے میں آ گئے تھے..... تب ان میں سے بہت سوں کو یہ بھی یاد آیا کہ مسلسل بیس برس تک تو ہم نہ صرف یہ کہ جمہوریت کا راگ الاپتے رہے تھے اور جمہوریت جمہوریت کی رٹ لگاتے رہے تھے بلکہ بحالیٔ جمہوریت کی جملہ تحریکوں میں ہراول دستے کی حیثیت سے شریک رہے تھے..... اب یہ ایک فوجی آمر کے ساتھ تعاون کیسا؟

سب جانتے ہیں کہ اس مرحلے پر جماعت کی قیادت دو ٹکڑیوں میں منقسم ہو گئی تھی..... ایک 'تصور پسند' (IDEALIST) ٹکڑی جو از سرِ نو بحالیٔ جمہوریت کی تحریک میں مؤثر کردار ادا کرنے کی خواہشمند تھی'..... اور دوسری 'حقیقت پسند' (REALIST) ٹکڑی جس کے موقف کی ترجمانی راقم الحروف کو حسنِ اتفاق ہی سے نہیں' بالحسنِ اتفاق براہ راست

جماعت کے ایک نائب امیر چودھری رحمت الٰہی صاحب کی زبانی سننے کا شرف حاصل ہوا[1]۔
یعنی : ”بحالیٔ جمہوریت کی بار بار کی تحریکوں کا یہ تلخ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ محنت اور مشقت سب سے بڑھ کر جماعت اور اس کے کارکن کرتے ہیں لیکن نتائج و ثمرات میں سے ہمیں کوئی حصہ نہیں ملتا...... اور پورے کا پورا فائدہ کوئی اور فرد یا گروپ یا جماعت لے اڑتی ہے۔ لہٰذا اب ہم اس قسم کی کسی تحریک میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں! “ (روایت بالمعنٰی)

یہ حقیقت بھی جملہ سیاسی کارکنوں کے علم میں ہے کہ اوّل الذّکر رائے کی وکالت ضیاء الحق صاحب کے پورے دورِ حکومت میں جماعت کی کراچی کی قیادت کرتی رہی جس کے ایک نمایاں فرد یعنی پروفیسر غفور احمد صاحب جس درجہ شدید ذہنی دباؤ سے دوچار رہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ ایک مرتبہ وہ کراچی میں تیورا کر گرے اور زخمی ہو گئے اور جب ان سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو انہوں نے کچھ اس قسم کا جواب دیا کہ ”موجودہ حالات میں انسان کو چکر نہیں آئے گا تو اور کیا ہو گا؟ “...... جبکہ مؤخّر الذّکر موقف کی وکالت پنجاب گروپ کرتا تھا جن کے سب سے بڑے ترجمان تو غالباً چودھری رحمت الٰہی صاحب ہی تھے...... تاہم چونکہ امیرِ جماعت میاں طفیل محمد صاحب کے دل میں ضیاء الحق صاحب کے لئے کچھ زیادہ ہی نرم گوشہ موجود تھا لہٰذا فیصلہ کن بالادستی اسی گروپ کو حاصل رہی۔ نتیجتاً جماعت عُرفِ عام میں مارشل لاء کی ”بی ٹیم“ قرار پائی اور اس کا سیاسی اور جمہوری گراف بہت نیچے چلا گیا۔

ادھر محترم صلاح الدین صاحب پیپلز پارٹی کے اعتبار سے نفسیاتی طور پر اس کیفیت میں مبتلا ہو گئے تھے جسے جدید سائکولوجی میں 'FIXATION' اور 'OBSESSION' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس میں ہر گز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اس خاص جماعت سے بُغض و عداوت کے معاملے میں پورے ملک میں ان کا مدِّمقابل یا 'برابر کی چوٹ' صرف ایک ہی شخص تھا...... یعنی اوّلاً چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور بعدازاں صدر پاکستان، جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم...... چنانچہ اس صورت حال کے دو فطری اور منطقی نتائج

---

[1] وسط ۱۹۸۱ء میں بلومنگٹن، انڈیانا، یو ایس اے، میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کے سالانہ کنونشن کے موقع پر!

بر آمد ہوئے : ایک یہ کہ رفتہ رفتہ وہ جنرل صاحب سے 'اور جنرل صاحب ان سے قریب سے قریب تر ہوتے چلے گئے..... اور دوسرے یہ کہ چونکہ بدقسمتی سے روزنامہ 'جسارت' کراچی سے شائع ہوتا تھا اور اس کی انتظامیہ پر جماعت کی کراچی کی قیادت کو بالادستی حاصل تھی اور اس میں ، جیسے کے پہلے عرض کیا جاچکا ہے' سیاسی مزاج کے حامل بلکہ باضابطہ 'جمہوریت پسندوں' کا غلبہ تھا' لہٰذا انہیں چار و ناچار 'جسارت' سے علیٰحدگی اختیار کرنی پڑی۔ البتہ انہوں نے علیٰحدگی سے قبل' گویا پیش دستی کے طور پر' پیپلز پارٹی کے خلاف طویل سلسلۂ مضامین قلمبند فرما کر..... اور اولاً اسے 'جسارت' میں قسط وار شائع کر کے اور بعد ازاں پمفلٹ کی صورت میں لاکھوں کی تعداد میں پورے ملک میں پھیلا کر اپنے ذہن کی چھاپ جماعت اسلامی کے عام کارکنوں کی اکثریت کے ذہنوں پر قائم کر دی۔

اور اس کا 'نقد' فائدہ انہیں اس صورت میں حاصل ہو گیا کہ جب روزنامہ 'جسارت' سے علیٰحدہ ہو کر انہوں نے ہفت روزہ 'تکبیر' جاری کیا تو جماعت اسلامی کے اندرونِ ملک اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر بیرونِ ملک حلقوں نے ان کے ساتھ نہایت فراخدلانہ تعاون کیا..... نتیجتاً..... ایک جانب اس کی مالی اساس نہایت مضبوط ہو گئی اور دوسری جانب جماعت اسلامی کے کارکنوں کے ذہنوں تک صلاح الدین صاحب کو وہ رسائی حاصل ہو گئی جو جماعت کی چوٹی کی قیادت' حتیٰ کہ اس کے امیر اور مرکزی شوریٰ تک کو حاصل نہیں! چنانچہ اپنی اس 'صلاحیت' کو انہوں نے متعدد مواقع پر جماعت کے رخ پر اثر انداز ہونے کے لئے 'ریموٹ کنٹرول' (REMOTE CONTROL) کے طور پر استعمال کیا۔

مارچ ۱۹۸۹ء میں 'تکبیر' اپنی زندگی کے پانچ سال مکمل کر لے گا۔ اس عرصے کے دوران جماعت اسلامی کی قیادت سے محترم صلاح الدین صاحب کے تعلقات میں دو بار بحرانی کیفیت پیدا ہوئی۔

اولاً..... اب سے تین چار سال قبل' جب انہوں نے جماعت کے سیاسی سوچ اور جمہوری مزاج کے حامل قائدین پر تنقید اور طنز و طعن کا سلسلہ شروع کیا اور جماعت کی ایک اہم شخصیت جناب خرم جاہ مراد نے اس کا سختی سے نوٹس لیا۔ نتیجتاً طویل اور تلخ 'جوابِ مضمونوں' کا سلسلہ چل نکلا..... اور صورت وہی بن رہی تھی کہ ع "بات چل نکلی ہے' اب دیکھیں کہاں تک پہنچے!" ..... لیکن چونکہ خرم صاحب نے اپنی مخلصانہ سادہ لوحی میں بعض 'ناگفتنی' باتیں بھی کہہ ڈالیں لہٰذا 'تکبیر' کو اپنی اخلاقی حیثیت کو مزید مستحکم کرنے کا موقع

مل گیا۔ اور بالآخر پانی کو جماعت کی جانب مرتا دیکھ کر امیر جماعت میاں طفیل محمد صاحب کو ذاتی مداخلت کے ذریعے صلح صفائی کرانی پڑی۔ (یادش بخیر! وہی دن تھے جب 'تکبیر' نے اس خاکسار کی جانب پہلی بار التفات فرمایا تھا اور راقم کا طویل انٹرویو آب و تاب کے ساتھ شائع کیا تھا۔)

ثانیاً..... جنرل ضیاء الحق مرحوم کے آخری ایام میں جب جماعتِ اسلامی کی امارت کی تبدیلی کے معاً بعد اس کی پالیسی میں بھی تبدیلی آئی'..... اور محترم قاضی حسین احمد صاحب کے انقلابی مزاج ..... اور زعماءِ کراچی کے سیاسی و جمہوری مزاج کے 'امتزاج' کے نتیجے میں جماعت اسلامی نے ضیاء الحق صاحب کی مخالفت شروع کی اور تحریکِ بحالیٔ جمہوریت (MRD) کی جانب پیش قدمی کا آغاز کیا۔ اور وہ عمل شروع ہوا جو کراچی میں اسلامی جمعیت طلبہ کی ایک بڑی ریلی میں راؤ رشید صاحب کے خطاب سے شروع ہو کر یہاں تک پہنچا کہ ایک جانب جماعت نے ضیاء الحق صاحب کے ترکش کے آخری تیر یعنی "نفاذِ شریعت آرڈیننس" کو "انسدادِ شریعت آرڈیننس" قرار دے ڈالا..... اور دوسری جانب جماعت نے پیپلز پارٹی کے ساتھ براہِ راست سلسلہ جنبانی شروع کر دیا اور نوبت بایں جا رسید کہ محترم پروفیسر غفور احمد صاحب محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ سے ملاقات کے لئے ۷۰۔ کلفٹن تک جا پہنچے..... تو فطری طور پر یہ صورتِ حال محترم صلاح الدین صاحب پر بہت شاق گزری' اور انہوں نے پینترے بدل بدل کر جماعت اسلامی پر حملے شروع کئے۔ یہاں تک کہ انہیں جماعت اسلامی کی ۱۹۵۱ء کی انتخابی پالیسی بھی یاد آ گئی جسے مرحوم ہوئے لگ بھگ چار دھائیاں بیت چکی تھیں اور جو عرصہ ہوا کہ "میر کے دین و مذہب" کی مصداقِ کامل بن چکی تھی! نتیجتاً اس دور میں 'تکبیر' اور جماعت کے مابین بُعد ہی نہیں نفرت و عداوت انتہا کو پہنچ گئی۔ چنانچہ بھرے جلسوں میں مدیر 'تکبیر' کی بھی لعن طعن اور سبّ و شتم سے تواضع ہوئی اور روایتی انداز میں 'تکبیر' کے پرچے بھی نذرِ آتش کئے گئے!

البتہ جب اگست ۸۸ء میں حادثۂ بہاولپور کے بعد پاکستان کی سیاست کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اور تاریخ ساز عدالتی فیصلوں نے نومبر ۸۸ء کے الیکشن کو یقینی بنا دیا۔ چنانچہ سیاست کی نئی بساط بچھی اور صبح و شام کے اکھیڑ پچھاڑ نے نئی صف بندیوں کو جنم دیا..... اور کسی 'غیبی اشارے' کے تحت جماعت اسلامی نے حیرت انگیز طور پر 'اباؤٹ ٹرن' کیا اور ضیاء الحق مرحوم کے سیاسی جانشین میاں نواز شریف صاحب سے تعلق استوار کر لیا تو 'تکبیر'

اور جماعت کے تعلقات کے ضمن میں بھی فوراً ہی ع " آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک! " کی کیفیت پیدا ہو گئی..... جو تا حال جاری ہے..... رہا مستقبل تو اس کا علم سوائے عالم الغیب والشّہادۃ کے اور کسی کو حاصل نہیں! ؎

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

الغرض، یہ ہے وہ تاریخی وواقعاتی اور ذہنی ونفسیاتی پس منظر جس میں محترم صلاح الدین صاحب نے راقم الحروف کے خلاف اُس صلیبی جنگ کا آغاز کیا ہے، جس میں وہ تمام حدوں کو پھلانگ گئے ہیں۔ انہیں صحیح یا غلط (اس کی وضاحت آئندہ کسی موقع پر ہی ہو سکے گی) یہ گمان ہو گیا ہے کہ میں پیپلز پارٹی کا حامی اور طرفدار ہوں، اور ظاہر ہے کہ یہ وہ جرم ہے جسے وہ کسی صورت معاف نہیں کر سکتے! اور اس معاملے میں جب انہوں نے جماعت اسلامی ایسی منظم اور ملک گیر ہی نہیں 'عالمگیر' جماعت سے براہ راست ٹکر لینے میں جھجک محسوس نہ کی تو ظاہر بات ہے کہ ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم تو کسی شمار قطار میں ہے ہی نہیں!

بہر حال راقم کو یقین ہے کہ، جلد یا بدیر، جیسے ہی ان پر حقائق واضح ہو جائیں گے انہیں اُس ظلم اور زیادتی کا بھی پورا احساس ہو جائے گا جو انہوں نے اپنے اِس دیرینہ نیاز مند پر روا رکھی ہے!...."

ہماری یہ تحریر، جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ایک ماہ قبل کی ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ یہ 'میثاق' کے گذشتہ شمارے میں شامل ہونے سے رہ گئی اور اس وقت ہدیہ قارئین ہو رہی ہے جب محترم صلاح الدین صاحب کی اپنی تحریروں سے ثابت ہو گیا ہے کہ اصل مسئلہ "عورت کی سربراہی" کا نہیں بلکہ ع "وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں۔ وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے!" کے مصداق پیپلز پارٹی کا ہے..... اور جماعت اسلامی کے ساتھ بھی ان کا دوبار سر پھٹول ہوا تو اس کا سبب بھی صلاح الدین صاحب کے اپنے الفاظ میں یہ تھا کہ انہوں نے " جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی میں مفاہمت کی پینگیں بڑھتی دیکھیں" ..... اور اب اس خاکسار کے خلاف جو صلیبی جنگ انہوں نے شروع کی ہے اس کی وجہ بھی ان کے خیال میں، یہ ہے کہ :

"اصل مسئلہ یہ ہے کہ اپنی دینی بصیرت اور اخلاقی اقدار سے گہری وابستگی کے باوجود پیپلز پارٹی ڈاکٹر صاحب کی ایک پسندیدہ سیاسی جماعت ہے۔ وہ دوسری تمام جماعتوں پر اسے ترجیح دیتے رہے ہیں۔ اسی کو وفاق کی سلامتی اور بقاء کا ضامن سمجھتے رہے ہیں اور اس معاملے میں وہ اس کی فکری، نظریاتی اور سیرتی خامیوں سے مسلسل صرف نظر کرتے رہے ہیں....."

اس ضمن میں صلاح الدین صاحب سے تو صرف دو مختصر باتیں عرض کرنی ہیں، ایک یہ کہ اگر آپ کے نزدیک "اصل مسئلہ" یہ تھا تو آپ کو براہ راست اسی کو موضوع تحریر بنانا چاہئے تھے اور اسی کے ضمن میں ع "کچھ ہم سے کہا ہوتا..... کچھ ہم سے سنا ہوتا!" پر عمل کرنا چاہئے تھا۔ یہ ہیرا پھیری والا انداز مسلمان کو زیب نہیں دیتا..... دوسرے یہ کہ کئی سال سے آپ ہمارے کرم فرماؤں میں شامل ہیں۔ متعدد بار محاضرات قرآنی میں شمولیت کے علاوہ آپ نے اکثر جب محترم مجیب الرحمٰن شامی کے یہاں قیام پذیر ہونے کے باعث نماز فجر قرآن اکیڈمی کی مسجد میں ادا کی تو میری درخواست کو شرف قبول عطا فرماتے ہوئے میرے ساتھ چائے نوش فرمائی اور طویل نشستیں اور گفتگوئیں رہیں تو ان کے دوران آپ نے کبھی اپنے ایک 'گمراہ بھائی' کا حق نصح و خیر خواہی کیوں ادا نہ کیا اور اس موضوع پر کیوں بات نہ کی کہ ہم بھی اپنا موقف تفصیلاً آپ کے سامنے رکھ سکتے!

تاہم اس موضوع پر کچھ وضاحتیں ہم "میثاق" کے عام قارئین اور تنظیم اسلامی کے عام وابستگان اور خیر خواہ حضرات کے علاوہ خاص طور پر اپنے ان "نیاز مندوں بلکہ مقربین" کی خدمت میں پیش کر دینا چاہتے ہیں جو بقول صلاح الدین صاحب اس مسئلے کی بنا پر "ذہنی ہلچل" میں مبتلا ہیں۔

اولاً..... یہ کہ بحمد اللہ گذشتہ ۲۳ برس سے ہماری جملہ صلاحیتیں اور قوتیں اور تمام اوقات اقامت دین اور غلبہ اسلام کے مقصدِ عظیم کے خاطر ایک جانب قرآن کے انقلابی فکر، اور دین کی انقلابی دعوت کی نشر و اشاعت اور دوسری جانب ایک انقلابی جدوجہد کے لئے مردانِ کار کی فراہمی اور تنظیم و تربیت کے لئے وقف ہیں۔ ان میں سے مقدم الذکر کا مظہر ہیں انجمن خدام القرآن، قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج اور مؤخر الذکر کا عنوان ہے تنظیم اسلامی!

ثانیاً..... چونکہ انقلاب کہیں خلا میں نہیں بلکہ کسی خطۂ زمین ہی میں آتا ہے اور

ہماری جدوجہد کا اولین ہدف پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے' لہٰذا یہاں کے معروضی حالات سے ہم لاتعلق نہیں رہ سکتے...... اور ہمارے ساتھیوں اور کارکنوں کے لئے یہاں کے سماجی و معاشرتی' معاشی و اقتصادی اور قومی و سیاسی مسائل اور ان کے تاریخی پس منظر اور اسباب و علل کا گہرا شعور اور صحیح فہم و ادراک بہت ضروری ہے...... تاکہ ان کے حل کے ضمن میں اسلام کی صحیح رہنمائی کو سمجھا بھی جاسکے اور عوام الناس کے سامنے پیش بھی کیا جاسکے!...... یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف اپنی تحریروں اور تقریروں میں ملکی و سیاسی حالات پر تبصرے بھی کرتا رہا اور مشورے بھی دیتا رہا...... اور بعض مواقع پر اس نے نہایت تفصیلی سیاسی تجزیئے بھی سپرد قلم کیئے!۔

ثالثاً .... جس طرح مغربی تہذیب کے زیر اثر جو سائنسی اور ٹیکنیکی ترقی ہوئی ، بجائے خود غلط نہیں ہے' بلکہ اس میں خرابی اس سے پیدا ہوئی کہ اس کے ساتھ نہ صرف یہ کہ متوازن و متناسب اخلاقی و روحانی ترقی نہیں ہوئی بلکہ الٹا تنزل ہوا' .... اسی طرح مغرب میں سیاست و معیشت کے میدان میں جو سماجی ارتقاء ہوا ہے اور انسان نے "حریّت' اخوت اور مساوات" کی اعلیٰ اقدار تک رسائی کی جو کوشش کی ہے وہ بھی سراسر غلط نہیں ہے.......... بلکہ اس کی مجموعی سمت صحیح اور مطابقِ اسلام ہے' تاہم اس کے ساتھ بھی وہی حادثہ ہوا ہے جسے اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

(اس تیسری بات کے ضمن میں "فکرِ اقبالؔ" کے حوالے سے ہماری مفصل رائے بحمداللہ اس خطبہ میں آگئی ہے جو ۲۱ر اپریل ۸۶ء کو "یومِ اقبالؔ" کی تقریب میں پڑھا گیا تھا۔ اور انشاءاللہ جلد کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا)۔

رابعاً.......... پاکستان کے موجود الوقت ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی ظروف و احوال میں جو تحریک ' سیاسی حقوق ' کے حصول کے لئے چلائی جائے گی وہ کامیابی کی صورت میں لامحالہ ' لادین جمہوریت ' پر منتج ہوگی' اور جو تحریک معاشی عدل کے عنوان سے چلائی جائے گی وہ بصورت کامیابی ملحدانہ سوشلزم کو جنم دے گی۔

بنابریں...... ہم نے آج تک نہ ' عملی سیاست ' کے میدان میں قدم رکھا' نہ ہی ' بحالی جمہوریت ' کی کسی تحریک میں حصہ لیا۔ بلکہ

"کارِ خود کُن کارِ بیگانہ مکُن..... برزمینِ دیگرے خانہ مکُن!" کے مصداق وقتی سیاست کے ضمن میں تبصروں اور مشوروں اور معاشی وسیاسی حقوق کے ضمن میں اخلاقی تائید پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی تمام مساعی کو عملاً اپنے "اصل کام" یعنی اسلامی انقلاب کے لئے ذہنی وفکری رہنمائی، اخلاقی وعملی پیش قدمی اور دعوتی اور تنظیمی سرگرمیوں پر مرتکز رکھا!۔

خاصاً ..... پاکستان کے معروضی حالات میں "مارشل لاء" بدترین سمِّ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ اسی نے اصل پاکستان کو دولخت کیا تھا، اور اسی سے شدید اندیشہ تھا کہ بچا کھچا پاکستان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اس معاملے میں ہم سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ہماری احساس کی شدت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دسمبر ۱۹۸۲ء میں سابق صدر پاکستان، جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے نام خط میں راقم نے لکھ دیا تھا کہ :

"مجھے شدید اندیشہ ہے کہ مستقبل کا مؤرخ یہ نہ لکھے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے وقت کی جو عظیم ترین مملکت قائم ہوئی تھی اسے پہلے تو دولخت کیا تھا ایک شرابی اور زانی ٹولے نے، اور پھر اس کے مزید حصے بخرے ہونے — یعنی — (BALKANISATION) کا عمل ایک ایسے شخص کے ہاتھوں سرانجام پایا جو نمازی اور پرہیزگار تھا....."

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے یہی عرض کیا تھا کہ خدارا سیاسی عمل کو نہ روکیے..... پھر اوائل ۸۲ء میں مرحومہ شوریٰ کے اجلاس میں عرض کیا تھا کہ اگر انتخابات کے انعقاد سے پاکستان کو کوئی گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے تو ہمیں اعتماد میں لے کر اس کے دلائل و شواہد ہمارے سامنے رکھ دیئے جائیں، خواہ اس کے لئے بالکل اسی طرح کا "بند اجلاس" (CLOSE-DOOR SESSION) منعقد کر لیا جائے جیسا خارجہ پالیسی پر بحث کے لئے کیا گیا تھا تاکہ اگر ہم قائل ہو جائیں تو عوام کو بھی قائل کرنے کی کوشش کریں، بصورت دیگر میرے نزدیک انتخابات کا التوا خودکشی کے مترادف ہے..... اور پھر وسط ۸۲ء کے بعد سے تو راقم نے مسلسل مارشل لاء یا نیم مارشل لاء کے تسلسل کے خلاف اور بھرپور سیاسی وجمہوری عمل کی کامل بحالی کے حق میں مقدور بھر "جہاد باللسان" کیا۔ تاہم عملاً نہ ایم آر ڈی میں شمولیت اختیار کی، نہ پیپلز پارٹی سے "پینگیں بڑھائیں"! یہ دوسری بات ہے

کہ چونکہ اس دور میں بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کا جزو اعظم پاکستان پیپلز پارٹی تھی لہٰذا ہماری جمہوریت اور انتخابات کی اس تائید کو ہمارے بہت سے مخلص کرم فرماؤں نے بھی پیپلز پارٹی کی حمایت قرار دیا۔

سادساً..... بہاولپور کے حادثۂ فاجعہ یا اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت کے تحت جب پاکستان میں بحالی جمہوریت کا مرحلہ آیا اور انتخابات کے انعقاد کی توقع ہوئی تو پیپلز پارٹی کے لئے صرف اس ایک 'کلمۂ خیر' کے سوا کہ "اس نے گیارہ سال تک جبر و ابتلاء کا مقابلہ کر کے اپنا ایک عوامی اور سیاسی پارٹی ہونا ثابت کر دیا ہے"..... کوئی اور تائیدی کلمہ کبھی نہ زبان سے نکلا' نہ قلم سے.....!! اس کے برعکس زوردار مشورہ اس کا دیا گیا کہ مسلم لیگ کو مضبوط بنایا جائے اور وہ جملہ عناصر جو پاکستان میں نظام مصطفیٰؐ کے قیام کے لئے انتخابی عمل پر اعتماد کرتے ہوں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ رہے ہم خود' تو چونکہ اقامت دین یا غلبہ دین کے لئے انتخابی عمل کو غیر مفید ہی نہیں مضر سمجھتے ہیں' لہٰذا ہم اس اکھاڑے میں داخل نہیں ہو سکتے' البتہ پارٹیوں کے بارے میں ہمیں۔ "غالبؔ نہ لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض..... ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے!" کے مصداق نہ پی پی پی سے کوئی غرض ہے نہ آئی جے آئی سے بلکہ کل غرض ہے صرف اور صرف جمہوریت سے! اب اگر ع "اس پہ بھی ہم سے گلہ ہے کہ وفادار نہیں!"... تو ع "کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا"۔

اس ضمن میں راقم اسی شمارے میں اپنے ۷۰۔ ۱۹۶۹ء کے بعض سیاسی تجزیوں سے کچھ اقتباسات شائع کر رہا ہے جس میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو' بھٹوازم اور "جمہوریت' سوشلزم اور اسلام" کے بارے میں راقم کی آراء سامنے آ جائیں گی..... ہر انصاف پسند شخص اگر ان کے ساتھ ان حقائق کو بھی پیش نظر رکھے تو اسے ہمارے مندرجہ بالا موقف کی صحت کے بارے میں کوئی شک نہ رہے گا کہ اس کے باوجود کہ بھٹو صاحب پانچ برس تک پاکستان میں "کوسِ لمن الملک" بجاتے رہے' راقم نے ان کا قرب حاصل کرنا تو کجا ان سے کبھی ملاقات تک نہ کی..... بلکہ ۱۹۷۰ء کی الیکشن مہم کے دوران تو ان کی دو تقریروں میں ان کی صورت دیکھنے میں آئی بھی تھی ان پانچ سالوں کے دوران تو ان کی شکل بھی کبھی نہ دیکھی!..... حتیٰ کہ ان کے دور میں جب لاہور ٹیلی ویژن نے اصرار کیا کہ ٹی وی پر جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے بارے میں اپنی رائے پیش کروں تو اس کے باوجود کہ بعض ایسے علماء نے بھی اس

کارِ ثواب میں حصہ لیا جن کی میرے دل میں قدر و منزلت ہے (مثلاً جماعت اسلامی کے سابقون الاوّلون میں سے مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی مرحوم) خود میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں حُبِّ علیؓ کا قائل ہوں، بُغضِ معاویہؓ کا نہیں! (یہاں اگر قارئین چاہیں تو "تُعرف الاشیاء باضدادھا" کے مطابق فوری تقابل اور موازنے کے لئے یاد تازہ فرمالیں ان صاحب کی جو ایک وقت میں جماعت اسلامی کے کم از کم لاہور اور پنجاب کی حد تک نمایاں ترین لیڈر بن گئے تھے، پھر وہ پہنچے سابق صدر ایوب خان کی خدمت میں، پھر جب ان کا سنگھاسن ڈولنے لگا تو انہوں نے پینگیں بڑھائیں شیخ مجیب الرحمٰن سے، اور جب شیخ صاحب موصوف نے مغربی پاکستان کو اپنے سیاسی نقشے سے خارج کر دیا تو وہ جا حاضر ہوئے بھٹو صاحب کی خدمت میں، اور جب ان کو پھانسی دے دی گئی تو انہوں نے راہ رسم پیدا کی مرحوم ضیاء الحق صاحب سے!..... آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!)

بہرحال ہمارے جملہ موافقین اور مخالفین ہمارے اس موقف کو اچھی طرح سمجھ لیں، پھر اگر اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو اسے دلائل کے ساتھ واضح کریں اور اگر وہ صحیح ہے تو اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اس پر استقامت عطا فرمائے..... رہی ہماری "رائے" کا معاملہ تو وہ بحمداللہ تائید و تحسین، یا تردید و مخالفت حتیٰ کہ سبّ و شتم، اور ان کے ضمن میں اقلیت و اکثریت سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے! اور ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم، بلاشائبہ فخر و تعلّی، عرض کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف اپنے رب اور اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے اور الحمدللہ کہ اگر اس کا ضمیر کسی بات پر مطمئن ہو تو پھر معاملہ وہی ہوتا ہے کہ ؎

کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہے مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے!

محترم صلاح الدین صاحب نے راقم کی 'تحلیلِ نفسی' کے ضمن میں جو مزید وضاحت کی ہے اور "مولانا مودودیؒ کی فکر اور ان کی تنظیم سے" ہماری جس "طویل اور مسلسل لڑائی" اور "ذہنی کشمکش"..... اور "متبادل قائد اور متبادل تنظیم کے تصوّرات" کا حوالہ دیا ہے..... اس کے ضمن میں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین کے سامنے اپنا موقف اختصار کے ساتھ شق وار انداز میں رکھ دیا جائے۔

(اتفاق سے ان ہی دنوں ایک مجلسی گفتگو میں یہ بات اس طرح سامنے آئی تو سب نے محسوس

کیا کہ چند جملوں میں ایک طویل بحث بہت خوبصورتی سے سمٹ آئی ہے)۔

۱۔ قبل از تقسیم ہند' مولانا مودودی مرحوم کے فکر' موقف اور طرز عمل' خصوصاً ان کے تصور دین اور تصور فرائض دینی کو' میں مجموعی اعتبار سے صحیح اور درست سمجھتا ہوں..... اور سوائے دو باتوں کے قبل تقسیم کی جماعت اسلامی سے ہمارا کوئی اہم اختلاف نہیں ہے یعنی ایک یہ کہ مولانا کے مزاج میں انتہاپسندی تھی جس کے زیر اثر انہوں نے جس چیز سے اختلاف کیا اسے کفر قرار دے کر چھوڑا۔ اور دوسرے یہ کہ مروجہ تصوف سے بیزاری کے باعث وہ ایمان کے باطنی ثمرات اور روحانی و نفسیاتی کیفیات کی جانب کماحقہ توجہ نہ دے سکے! چنانچہ بحیثیت مجموعی جماعت کے لوگوں میں اس پہلو سے شدید کمی رہی!۔

۲۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد انہوں نے دو اقدام کئے۔ جن میں سے ایک کو میں صد فیصد درست سمجھتا ہوں اور دوسرے کو اتنا ہی غلط اور مہلک! درست اقدام تھا ایک پریشر گروپ کی حیثیت سے دستوری مطالبے کی مہم چلا کر دستور ساز اسمبلی سے "قرارداد مقاصد" کا پاس کرا لینا۔ جس میں انہیں جملہ مذہبی عناصر کی تائید اور امداد حاصل رہی..... اور غلط اور مہلک اقدام تھا انتخابات کے اکھاڑے میں داخل ہو کر نہ صرف اپنی مخالفت میں جملہ سیاسی اور مذہبی عناصر کو جمع کر دینا..... بلکہ خود اسلام کو بھی ایک متنازعہ معاملہ اور گویا "الیکشن ایشوء" بنا دینا!۔

۳۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے آغاز پر جو طرز عمل اختیار کیا گیا وہ بھی پچاس فیصد درست تھا اور پچاس فیصد غلط۔ اس کا صحیح جزو تھا جمہوریت کی تائید اور آمریت کی مخالفت..... اور غلط جزو تھا خود بحالی جمہوریت کی تحریکوں میں عملاً شرکت! جس کا نتیجہ بالفعل وہی نکلا جو اوپر چوہدری رحمت الٰہی صاحب کی ۸۱ء کی ایک گفتگو کے حوالے سے بیان ہو چکا ہے۔

۴۔ رہے مولانا مودودی مرحوم کے علمی افکار اور نظریات تو ان کے ضمن میں چونکہ مولانا مرحوم نے ہزارہا صفحات تحریر فرمائے لہٰذا ان کے بے شمار علمی نظریات میں سے بہت سوں سے اتفاق ہے تو بہت سوں سے اختلاف بھی ہے تاہم مجموعی طور پر راقم کی رائے یہ ہے کہ.....

(ا) اسلام کے تصور عبادتِ ربّ' اور بندۂ مومن کے فرائضِ دینی کے بارے میں ان کے نظریات مجموعی طور پر درست ہیں' (ب) اسی طرح "اسلام کے نظام حیات" کے بارے میں بھی ان کی تعبیر و تشریح بہت حد تک درست ہے' بالخصوص اسلام کے معاشرتی اور سیاسی نظام کے بارے میں ان کی تشریحات بہت قیمتی ہیں' البتہ معاشی نظام کے بارے میں ان کی سوچ بعض اعتبارات سے (خصوصاً زمینداری اور مزارعت کے باب میں) اصولی طور پر غلط بھی

ہے' اور وقت کے تقاضوں کے اعتبار سے بہت ناقص بھی۔ (ج) البتہ ان کے دو علمی نظریات' جن کا ظہور بحمداللہ ہمارے جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد ہوا (خواہ اس کے جراثیم ان کے فکر میں ابتدا سے موجود رہے ہوں!) نہایت گمراہ کن ہیں: ایک نظریہ حکمت عملی جس کی بروقت بیخ کنی ان کے دیرینہ رفیق کار مولانا امین احسن اصلاحی نے حق رفاقت ادا کرتے ہوئے باحسن وجوہ کر دی تھی..... اور دوسرے مشاجراتِ صحابہؓ کے ضمن میں ان کا نقطۂ نظر اور بعض اکابر صحابہؓ خصوصاً خلیفہ راشد' ذوالنورین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ان کی جارحانہ تنقید جو ان کی تالیف "خلافت وملوکیت" میں سامنے آئی اور جس پر اہل سنت کے جملہ حلقوں کی جانب سے بجا طور پر شدید ردِّ عمل ظاہر ہوا۔

۵۔ رہا مولانا مودودی کا فلسفۂ 'نظمِ جماعت' اور ان کا تصوّرِ "شورائیت" تو اسے بھی ہم علمی طور پر درست اور تحریکی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ سمجھتے ہیں..... اور ہمارا اعتراض مولانا مرحوم پر صرف یہ ہے کہ انہیں اپنی رائے کا ابتدا ہی میں برملا اظہار کر دینا چاہئے تھا..... اور اس کے ضمن میں کسی دباؤ میں آکر مصالحت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ دراصل یہ اسی ابتدائی غلطی کے تلخ ثمرات تھے جو ۱۹۵۵ء سے ۵۸ء تک نہایت بھیانک انداز میں ظاہر ہوئے! جن سے ان کے بعض نہایت قریبی اور دیرینہ رفقاء کو بھی شدید صدمہ پہنچا..... اور خود ان کی شخصیت بھی شدید مجروح ہوئی!

الغرض ع "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" _____ اس پر چاہیں تو اتنا اضافہ اور کرلیں کہ ہمارے نزدیک غلطی سے مبرّا اور خطاؤں سے معصوم صرف انبیاء کرام ہوتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے اختتام اور رسالت کی تکمیل کے بعد اب اقامتِ دین کی جدوجہد خطا اور نسیان کے پُتلوں ہی کے ہاتھوں ہو گی! (الانسان مرکب من الخطاء و النسیان)..... اور اس سلسلے میں "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کی بجائے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ پہلی کوششوں کے تسلسل کو جاری رکھا جائے اور سابقہ کوششوں پر تنقیدی نگاہ ڈال کر ان کی غلطیوں کو دُور اور ان کی کوتاہیوں کی تلافی کرتے ہوئے' گویا کچھ منفی اور کچھ جمع کرتے ہوئے' از سرِ نو کمرِ ہمت کسی جائے اور نئے مسافروں کی تلاش کے ساتھ ساتھ "کھوئے ہوؤں کی جستجو" بھی جاری رکھی جائے..... اور اپنی بساط کے مطابق بفضلہٖ تعالیٰ وبتوفیقہٖ اسی کی کوشش راقم اور اس کے ساتھی کر رہے ہیں' اس دعا کے ساتھ کہ۔

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر! !

اب اس کا اختیار ع "جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے" کے مصداق ہر شخص کو حاصل ہے کہ خواہ اسے خلوص اور احساس فرض پر مبنی قرار دے' خواہ "ذہنی کشمکش" ..... اور "منتبادل قائد" بننے کی خواہش کا مظہر قرار دے۔

(۲)

کئی سال سے مسلسل یہ احساس ہو رہا تھا کہ راقم کے دورس قرآن اور تقریروں اور خطابات اور ان کے سلسلے میں اندرون ملک اور بیرون ملک سفروں اور دوروں کی کثرت کے باعث تحریر کا کام بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ جس کے باعث تحریکی تقاضے مجروح ہو رہے ہیں' چنانچہ کئی بار فیصلہ کیا گیا کہ اب لسانی جہاد کم اور قلمی جہاد زیادہ کیا جائے اور خاص طور پر سفر بہت کم کر دیئے جائیں۔ لیکن بوجوہ اس پر عمل نہیں ہو پا رہا تھا۔ اب سے چھ سات ماہ قبل راقم نے پہلے اپنے طور پر اس کا حتمی فیصلہ کیا۔ پھر تنظیم کی مرکزی مجلس مشاورت کے سامنے رکھا تو سب نے اس کی پرزور تائید کی..... چنانچہ فیصلہ کر لیا گیا کہ.....

اولاً..... آئندہ اصولی طور پر راقم کے خطابات صرف تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے ہوں گے اور وہ بھی ناگزیر حد تک..... اور دعوتی دوروں کا سلسلہ بہت کم کر دیا جائے گا۔

ثانیاً..... لاہور کے خطاب جمعہ' اور ہفتہ وار درس قرآن کے علاوہ میرے جملہ پروگرام ایک کمیٹی طے کرے گی جس میں ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان' ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن و تنظیم اسلامی بیرون پاکستان' معتمد تنظیم اور ناظم مکتبہ شامل ہوں گے۔ میں از خود کسی دعوت کو قبول نہیں کروں گا۔

ثالثاً..... میں صبح کے اوقات میں ملاقات سے استثنائی صورتوں کے علاوہ معذور ہوں گا۔ ملاقات کی ایک عمومی نشست' ان شاء اللہ پابندی کے ساتھ' جمعۃ المبارک اور ہفتہ کے دن کے سوا' روزانہ عصر تا مغرب قرآن اکیڈمی کی مسجد ہی میں منعقد ہو گی' علیحدہ ملاقات' وقت طے کر کے' ان ہی ایام میں صرف مغرب اور عشاء کے مابین ہو سکے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان فیصلوں پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے..... اور جس طرح اس نے اس بندہ ناچیز کی زبان کو اپنی کتاب مبین کی دعوت و تبلیغ اور اس کے فلسفہ و حکمت کے بیان کے لئے کھول دیا اسی طرح اس کے قلم کو بھی حق کے بیان و اعلان کی توفیق عطا فرمائے..... اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ - آمین

حدیثِ رسولؐ

وعن

عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ

قَالَ: بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ
عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ
فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ
وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ
وَعَلَى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا
وَاَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ
مِّنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ،
وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ
لَوْمَةَ لَآئِمٍ (بخاری و مسلم)

مفہوم: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ:

ہم ہر حالت میں اللہ اور رسول اور اُن لوگوں کی جن کو امیر مقرر کیا گیا ہو بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ خواہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی اور خوشی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی اور اُس صورت میں بھی جب کہ دوسروں کو ہمارے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہو۔ امیر سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے کہ امیر سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو۔ اُس وقت ہمارے پاس دلیل ہوگی کہ ہم اُس کی بات نہ مانیں اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

الداعی الی الخیر: میاں عبدالواحد
بھگوان سٹریٹ
پُرانی انارکلی لاہور

مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اور بھٹو ازم

★

جمہوریت، سوشلزم اور اسلام

★

اور

پاکستان کی مذہبی سیاست

★

کے بارے میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ۱۹۶۹-۷۰ء کی تحریروں کے اقتباسات

مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اور بھٹو ازم

—(۱)—

نقطۂ آغاز

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے اثرات
اور پاکستانی سیاست میں دائیں اور بائیں بازوؤں کی کشمکش

(میثاق، جنوری ۶۹ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' سے دو اقتباس)

۔ ۶۵ء کی پاک ہند جنگ بلاشبہ گزشتہ صدارتی انتخابات کے بعد کے دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ ملک کے بقاء و دفاع اور خاص طور پر اس کی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے ہی، ملک کی داخلی سیاست پر بھی اس کے بہت گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ہمیں یہاں اس سترہ روزہ جنگ کے اسباب و علل سے تو سرے سے کوئی بحث ہی نہیں، اس کے تمام عواقب و نتائج کا استقصاء بھی مطلوب نہیں، البتہ ان میں سے چند ایسے امور کا تذکرہ ناگزیر ہے جن کا براہ راست تعلق ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال سے ہے۔

○ ...... ان میں سے اہم ترین امر تو یہ ہے کہ اس جنگ کے جو نتائج بر آمد ہوئے ان کی بنا پر صدر ایوب کی سیاسی حیثیت کو شدید دھکا لگا اور ان کا جو ستارہ ایشیا کے ایک عظیم رہنما یا بالفاظ دیگر ایشیائی ڈیگال کی حیثیت میں عروج کی جانب حرکت کر رہا تھا مائل بہ زوال ہو گیا۔

○ ...... دوسرے یہ کہ پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی جو چند سال قبل سے مسلسل ایک خاص رخ پر بڑھتی چلی جا رہی تھی ایک انتہا پر پہنچ کر نہ صرف یہ کہ رک گئی بلکہ واپس قدیم سمت میں گردش کرنے لگی...... اور بظاہر احوال بھی اس میں کم از کم اعتدال کا رنگ نمایاں ہو گیا۔

○ ...... تیسرے یہ کہ مسلم قومیت کا جو جذبہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنا تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد جلد ہی سرد پڑ گیا تھا۔ اس جنگ کے دوران نہ صرف یہ کہ

ایک دم پھر بیدار ہوا بلکہ ایک بار پھر اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا۔ اگرچہ اس کا یہ زور شور (TEMPO) اب کی بار بھی عارضی ہی ثابت ہوا۔ اور جنگ کے بعد جلد ہی یہ جذبہ پھر سرد پڑنا شروع ہو گیا۔

پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی اور پاکستان قومیت دونوں کے اعتبار سے پاکستان کی سیاسیات میں جو مدّ اس جنگ کے دوران آیا تھا' صدر ایوب کو تو اپنی مخصوص ذمہ دارانہ حیثیت کی مجبوریوں کی بنا پر اسے ایک خاص حد تک لے جانے کے بعد واپس جذر کی جانب لوٹنا پڑا...... لیکن ان کے ایک اپنے تربیت دادہ نوجوان ساتھی نے مدّ سے جذر کی جانب رجوع سے انکار کر دیا اور وہ اسی مقام پر کھڑا رہ گیا۔ نتیجتاً اس نے اس مدّ کے لئے علامتی حیثیت اختیار کر لی...... بس یہیں سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اصل ذاتی سیاسی زندگی اور پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہو گیا!!

(ماخوذ از میثاق، جنوری ۱۹۶۹ء)

(۱۱)

سوشلسٹ ذہن اور بائیں بازو کے رجحانات مشرقی پاکستان کی حد تک تو کم از کم اتنے ہی 'قدیم' ہیں جتنا خود پاکستان' لیکن مغربی پاکستان میں یہ رجحانات زیادہ تر ۶۵ء کی جنگ کے بعد ابھرے ہیں اور گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصے میں' اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رجحانات تیزی کے ساتھ پھیلے بھی ہیں اور مختلف تنظیمی ہیئتوں کی شکل میں نمودار بھی ہوئے ہیں' اس کا ایک سبب ملک کی معیشت میں 'صنعتی انقلاب' کے اثرات بھی ہیں' جن سے موجودہ استحصالی نظامِ معیشت کی گھناؤنی صورت کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بیکاری سے بھی ان رجحانات کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری گزشتہ پانچ چھ سال کی خارجہ پالیسی نے بھی' جس کے مدّ و جذر کے جانب ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں ان رجحانات کو تقویت دی ہے...... غرض کہ مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر ہمارے ملک میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی قوت کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان

میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں لیکن ان کے اصل علامت کی حیثیت بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہو گئی ہے اور اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراکِ عمل کی کوئی واضح صورت تاحال سامنے نہیں آئی، تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ اصل مرکز (NUCLEUS) ہو گا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکو نواز) طبقے بھی جو اس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

(ماخوذ: میثاق، جنوری ۱۹۶۹ء)

(iii)

"عوام کی زندگی جس طرح دن بدن اجیرن ہوتی چلی جا رہی ہے اس کی بنا پر عوام تو عمر دیوانہ را ہوئے بس است!" کے مصداق بس اس کے منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی ذرا ہمت اور جرأت سے کام لے کر ایک بار کوئی زوردار نعرہ لگا دے۔

اور جہاں تک ہمت و جرأت کا تعلق ہے مسٹر بھٹو تو ماضیٔ قریب ہی میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان میں چاہے اور کسی چیز کی کتنی بھی کمی کیوں نہ ہو، ہمت و جرأت کی ہرگز کوئی کمی نہیں ـــــ رہے مولانا بھاشانی تو ان کا بھی پورا سیاسی کیریئر جرأت اور ہمت کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے ـــ!!

بنا بریں پاکستان کے سوشلسٹ عناصر کی جانب سے کسی انقلابی اقدام کا امکان خارج از بحث نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ بحالاتِ موجودہ بہت متوقع ہے!!!

لیکن اگر ایسا ہو گیا تو ـــــ ایک طرف تو اس کا نتیجہ ہمارے نزدیک ایک بہت بڑے خون خرابے کی صورت میں ظاہر ہو گا جو مغربی پاکستان میں تو چاہے زیادہ ہولناک نہ ہو، مشرقی پاکستان میں بالکل انڈونیشیا کے پیمانے پر ہو گا جس کے نتیجے میں پاکستان کا وجود تک سخت خطرے سے دوچار ہو سکتا ہے ـــــ اور دوسری طرف ایسے کسی اقدام سے ہمارے نزدیک بحالاتِ موجودہ سوشلسٹ عناصر کی کامیابی کے امکانات بھی بہت کم ہیں اس لئے کہ ان کا مقابلہ بیک وقت دو طاقتوں سے ہو گا۔ ایک طرف حکومتِ وقت ہو گی اور وہ بھی سیاسی نہیں فوجی جو امن و امان کو برقرار رکھنے کے فرض کو ادا کرے گی اور دوسری طرف مخالف سیاسی قوتیں ہوں گی جن کو اس

طرح آپ سے آپ گویا حکومت کا کور بھی حاصل ہو جائے گا ـــــ اور پاکستان کے سوشلسٹ عناصر ابھی اتنے طاقت ور بہرحال نہیں ہیں کہ ایسی دو طرفہ جنگ لڑ کر بھی کامیاب ہو جائیں۔ لہٰذا ہماری استدعا پاکستان کے سوشلسٹ عناصر سے یہی ہے کہ وہ اس آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سیدھی طرح سیاسی میدان میں اپوزیشن کا معروف کردار اختیار کر کے ایک مضبوط اور پیہم سیاسی عمل کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کریں ـــــ اور اس طرح ملک کے سیاسی و معاشی ڈھانچے میں وہ تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں جو انہیں مناسب اور ضروری معلوم ہوں۔"

(ماخوذ 'میثاق' فروری مارچ ۱۹۷۰ء)

(۲)

انقلابی کے بجائے سیاسی رُخ

اور تحریکِ پاکستان کی اصل 'روحِ باطنی' کی وراثت

('میثاق' مارچ ۱۹۶۹ء اور جون جولائی ۱۹۷۰ء سے دو اقتباس)

"صدر ایوب کی گفت و شنید کی دعوت نے پوری ڈی۔ اے۔ سی کو بالکل اچانک آ لیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تو وہ غریب شش و پنج میں مبتلا رہی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ صدر ایوب تو ایک فرد تھے، انہوں نے ایک رُخ پر چلتے چلتے اچانک اباؤٹ ٹرن کر لیا لیکن ایک تحریک کی رواں دواں گاڑی کو تو بریک لگاتے لگاتے بھی آخر وقت لگتا ہے۔ دوسری جانب یہ خطرہ بھی واقعی اور حقیقی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ایک قیادت عوامی تحریک کو بریک لگا کر نیچے اترے اُدھر دوسری قیادت اس کے انجن کو دوبارہ سٹارٹ کر کے لے کر چلتی بنے۔ تیسری طرف یہ معاملہ بھی صاف تھا کہ اب یہ عوامی تحریک اگر مزید آگے بڑھی تو اس کا روکنا مشکل تر ہو جائے گا اور پھر اس کا تمام تر فائدہ بائیں بازو کے لوگوں کے حصے میں آئے گا۔

یہ اسباب وعوامل تھے جن کی بنا پر وہ عمل اندرونی طور پر بڑی تیزی کے ساتھ لیکن ظاہری اعتبار سے بڑی تدریج اور مدھم چال کے ساتھ شروع ہوا جسے اب مسٹر بھٹو بجا طور پر "غیر فوجی انقلاب" (CIVILIAN COUP DE TAT) سے تعبیر کر رہے ہیں۔

مفاہمت اور مصالحت کا یہ عمل بنیادی طور پر تین لیگوں ہی کے مابین ہوا ہے اور اگر کوئی عبوری قومی حکومت" وجود میں آئی جس کا امکان بالکل خارج از بحث نہیں تو وہ اصلاً ان لیگ ہائے ثلاثہ ہی پر مشتمل ہوگی۔

اس عمل کی مخالفت ومزاحمت بھی جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا، بائیں بازو کے انتہا پسند لوگوں ہی کی جانب سے ہوئی۔ مسٹر بھٹو چونکہ ابھی کوئی مستحکم تنظیم نہیں رکھتے اور بدلتے ہوئے حالات نے گویا کم از کم وقتی طور پر تو ان کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی ہے۔ لہٰذا انہیں محض منفعلانہ مخالفت (PASSIVE RESISTANCE) پر اکتفا کرنا پڑا۔"

(ماخوذ میثاق، مارچ ۶۹ء)

(۱۱)

"ہمارے یہاں بھی خیر اسی میں ہے کہ یہ بات بطور اصولِ موضوعہ تسلیم کر لی جائے کہ جملہ معاملات ومسائل کا حل معروف سیاسی و جمہوری طریقوں پر ہوگا۔ اور سب کو یہ حق حاصل ہوگا کہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کر کے اختیار و اقتدار حاصل کرنے اور مسندِ حکومت پر قبضہ جمانے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سیاسی میدان کی پابندیوں کو حتی الامکان ختم کر دیا جائے اور جذبہ و فکر کے اثر و نفوذ کی تمام راہوں کو حتی الامکان سب کے لئے یکساں کھول دیا جائے۔ تاکہ کہیں کسی زیرِ زمین سرگرمی یا انقلابی طریق کار کی ضرورت کا احساس ہی پیدا نہ ہو۔ اس اعتبار سے ہمارے نزدیک مسٹر بھٹو کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پر سے بھی پابندی اٹھالی جانی چاہئے...... یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جذبہ و فکر کی راہوں کو کبھی مسدود نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ان کے ایک جانب بند باندھیں گے تو وہ دوسری جانب بہ نکلیں گے۔ ہمارے حالیہ تجربے سے تو یہ بات بالکل ہی ثابت ہو گئی ہے کہ کسی فکر کو پابند و پا بجولاں کرنا ممکن نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی پر ہمارے یہاں پابندی عائد رہی۔ لیکن کمیونسٹ انقلاب ہمارے نصفِ بہتر خطّے کے عین دروازوں تک پہنچ گیا تھا...... ! فکر کا مقابلہ جوابی فکر ہی سے کیا جا سکتا ہے اور معاملات و مسائل

کا حل ان کا مردانہ وار مواجہہ (FACE) کرنے ہی سے ممکن ہے۔ مصنوعی پابندیوں اور فراری ذہنیت سے کوئی معرکہ سر نہیں کیا جاسکتا!

ایک دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ ملکی سیاست کے میدان میں مذہب کا نام نہایت احتیاط کے ساتھ اور بالکل ناگزیر حد تک ہی لیا جانا چاہئے۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کا بالعموم مذہبی اعتبار سے جو حال ہے وہ سب ہی کو معلوم ہے اور خود عوام کی ایک عظیم اکثریت میں بنیادی اخلاقی و روحانی اقدار جس سطح پر ہیں وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ تو جب مذہب اس وقت نہ ہمارے فکر میں سرایت کئے ہوئے ہے نہ جذبے میں تو آخر سیاست کے میدان میں اس کی کارفرمائی کیسے ہوگی؟ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ دین و مذہب کے اعتبار سے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں اور شیخ مجیب الرحمان اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مابین کون سا فرق و تفاوت ہے؟..... بلکہ عجیب تر صورت یہ ہے کہ پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے داعیٔ اعظم مولانا بھاشانی تو علمائے دیوبند کے صحبت یافتہ اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ اور نظامِ اسلام پارٹی کے متعدد اہم کارکنوں کے ملّی و قومی جذبہ و اخلاص کے معترف ہونے کے باوجود ذاتی طور پر ہمیں معلوم ہے کہ وہ جمعے کی نماز پڑھنے کے بھی روادار نہیں!..... مقصود کسی کی تنقیص نہیں بلکہ صرف اس امر کی وضاحت ہے کہ ہمارے ملک میں مذہب بالکل بنیاد سے تعمیرِ جدید کا محتاج ہے اور احیاءِ اسلام کی آرزو رکھنے والے لوگوں کو پہلے فکر کے میدان میں اسلامی انقلاب اور عوامی سطح پر اسلام کی مخصوص اخلاقی و رُوحانی اقدار کی از سرِ نو ترویج کا کٹھن اور صبر آزما کام کرنا ہوگا۔ موجود الوقت حالات میں سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ لگانا اور سیاسی و معاشی مسائل میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے حامل لوگوں پر کفر و الحاد کے فتوے چسپاں کرنا بالآخر خود دین و مذہب کے لئے مضر ثابت ہوگا۔"

(ماخوذ 'میثاق' مارچ ۱۹۷۹ء)

(۱۱۱)

"مسٹر بھٹو کے بارے میں ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ وہ خود بھی 'انقلابی' سے زیادہ 'سیاسی' مزاج رکھتے ہیں اور ان کی تحریک بھی 'نظریاتی' سے زیادہ 'قومی' رنگ کی حامل ہے..... لہٰذا انہیں تو خالص انتخابی رنگ اختیار کرنے میں کسی دقّت کے پیش آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ چنانچہ انہیں زیادہ سے زیادہ یہ کرنا پڑا کہ انہوں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے جماعتی نظم میں چند "پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہ" نوجوانوں کو خارج کر کے اصل اہمیت

صاحبِ حیثیت اور ذی وجاہت لوگوں کو دے دی..... اور خود بھی زیادہ گرما گرم اور اشتعال انگیز باتیں کہنی بند کر دیں..... (اگرچہ عوام کے جذبات اور ان کی دلچسپی کے اعتبار سے جو کمی اس طرح واقع ہو سکتی تھی اس کو بعض دوسرے FIRE BRAND مقررین کی شعلہ نوائی سے پورا کرنا پڑا!) حد یہ ہے کہ سابق صدر ایوب خاں کے فیلڈ مارشل کے منصب کی بحالی ایسے اقدام پر بھی وہ مہر بلب رہے۔ ع

"کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!"

ویسے بھی صوبہ سندھ کی حد تک توان کی جماعت یا جمعیت پہلے ہی سے عوام سے زیادہ وڈیروں کے سہارے قائم تھی اب یہ رنگ مزید پختہ ہو گیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی باہمی سیاست میں مسٹر بھٹو آنے والے انتخابات میں کھوڑو اور قاضی فضل اللہ گروپ کا بھرپور مقابلہ کریں گے اور کیا عجب کہ انہیں شکست دینے میں بھی کامیاب ہو جائیں!""

"بہرحال بھٹو اور بھاشانی کے سیاسی وانتخابی لائن اختیار کر لینے سے پاکستان کے سر سے کسی فوری دھماکہ خیز انقلاب کا خطرہ ٹل گیا ہے اور سارا کھیل خالص سیاسی نوعیت کا رہ گیا ہے.......... فَلِلّٰہِ الحمد!!

ان تین چار ماہ کے دوران میں اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی پاکستان میں پورے زور شور سے اور مشرقی پاکستان میں کسی قدر کم قوّت کے ساتھ 'تحریک پاکسان' کا گویا از سرِنو احیاء ہو گیا ہے چنانچہ ایک طرف مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور نظریۂ ملّی کا راگ خوب الاپا جا رہا ہے۔ دوسری طرف "نظریۂ پاکستان" کی دہائی دی جا رہی ہے اور اس کے تحفظ کے لئے سرمایہ داروں کی تجوریوں کے منہ کھل گئے ہیں اور تیسری طرف اسلام 'اسلام' کا شور مچ رہا ہے اور بہت سے خوش گمان لوگوں کی آنکھوں میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اسلامی حکومت کے قیام کی امیدوں کے سوکھے چمن میں یکبارگی بہار کی آمد کے خیال سے چمک پیدا ہو گئی ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ اس تازہ احیاءِ شدہ "تحریک پاکستان" کے دل صد پارہ کے کچھ ٹکڑے کسی کے قبضے میں ہیں اور کچھ کسی دوسرے کے ہاتھ..... چنانچہ ایک طرف تحریکِ پاکستان کی 'مذہبی رومانویت' ہے جس پر کم از کم تا حال بلا شرکت غیرے پوری مضبوطی کے ساتھ جماعت اسلامی قابض ہے اور اس میں وہ کسی کو بھی شریک کرنے کو تیار نہیں حتیٰ کہ اس

کے اصل وارثین میں سے ایک گروہ جو علماء دیوبند کے تھانوی و عثمانی حلقوں پر مشتمل ہے نہ صرف پورا زور صرف کرنے بلکہ چھینا جھپٹی کرنے کے باوجود جماعت اسلامی کو اس 'قبضہ غاصبانہ' سے بے دخل کرنے میں ناکام ہو رہا ہے اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی کی طرف سے اس سلسلے کی مزید کارروائی کے سدِّباب کے لئے غالباً جماعت اسلامی متحدہ اسلامی محاذ کے قیام کے لئے گفت و شنید تک سے احتراز کرے گی..... حال ہی میں تحریک پاکستان کی مذہبیت کی وراثت کا دعویدار ایک دوسرا گروپ البتہ ایسا سامنے آیا ہے جو چاہے جماعت اسلامی کو اس 'قبضہ غاصبانہ' سے کُلّی طور پر بے دخل نہ کر سکے۔ بہرحال اس میں سے قابل لحاظ حصہ ضرور بٹوا لے گا' ہمارا اشارہ بریلوی مکتب فکر کے علماء اور مشائخ کی اس کانفرنس کی جانب ہے جو حال ہی میں "دارالسّلام" ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بڑی شان اور آن بان کے ساتھ منعقد ہوئی ہے اور جس میں متعدد مقرّرین نے جماعتِ اسلامی پر شدید لے دے کی ہے۔

دوسری طرف اس 'مذہبی رومانویت' کے بالکل برعکس تحریک پاکستان کے اصل اور اساسی محرّک یعنی ہندوؤں کے سیاسی' تہذیبی اور معاشی تسلط کے خوف اور اس سے بچاؤ کے جذبے کی وراثت ہے جس پر اتفاقاً ہی سہی بہرحال کم از کم مغربی پاکستان کی حد تک کلیتہً مسٹر ذوالفقار علی بھٹو قابض ہو گئے ہیں۔ تحریک پاکستان کا یہ اصل 'باطن' اس وقت دو صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ایک ہندوستان دشمنی اور دوسرے عوام کے معاشی حقوق کی بازیافت کی جدوجہد' ان میں سے مقدّم الذکر کی علامت (SYMBOL) تو مسٹر بھٹو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ہی میں بن گئے تھے اور مؤخر الذکر کی علامت وہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا کر بن گئے اور چونکہ ایک طرف یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تحریکِ پاکستان کے اساسی محرکات میں اصل فیصلہ کن حیثیت معاشی عوامل ہی کو حاصل تھی اور دوسری طرف اس حقیقت کا انکار بھی شدید قسم کی ڈھٹائی کے بغیر ممکن نہیں کہ اسلامی سوشلزم کا تصوّر "مصوّر پاکستان" علامہ اقبال کے یہاں تو پورے زور شور کے ساتھ موجود ہے ہی خود "خالق پاکستان" مسٹر محمد علی جناح اور ان کے دست راست خان لیاقت علی خاں کے یہاں بھی بصراحت مذکور ہے لہٰذا چاہے یہ کسی کو برا لگے چاہے بھلا' بہرحال واقعہ یہی ہے کہ تحریکِ پاکستان کی اصل 'روحِ باطنی' کے وارث مسٹر بھٹو ہیں (اگرچہ مغربی پاکستان میں ہندوستان دشمنی کی راہ سے خان عبدالقیوم خاں اور مشرقی پاکستان میں اُس خطّے کے معاشی حقوق کی

بازیافت کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے شیخ مجیب الرحمان بھی تحریک پاکستان کے اس جزو کی وراثت میں کسی حد تک شریک قرار دیئے جاسکتے ہیں)۔

تیسری طرف تحریک پاکستان کے اس 'جسد خارجی' کی وراثت کا مسئلہ ہے جو نواب زادوں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے مرکّب تھا اور دین و مذہب کے باب میں زیادہ سے زیادہ "لبرل اسلام" کا قائل تھا اور اگرچہ مسلم لیگ بطور ایک وحدت کے تو کبھی کی مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکی تاہم اس کے جسدِ خاکی کی اجزاء ابھی موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ٹھنڈے پیٹوں ہرگز اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری جماعت زبردستی تحریکِ پاکستان کی وراثت پر تنہا قابض ہو جائے اور مسلم لیگ کی واحد جانشین بن بیٹھے، اس لئے کہ بظاہر احوال تو تحریکِ پاکستان کی وراثت کے اصل مدعی وہ ہیں نہ کہ کوئی اور! (مسلم لیگ کے 'باقیات الصالحات' ہونے کی حیثیت سے تحریک پاکستان کی وراثت کے دعوے داروں میں فی الوقت مدّعی اعظم کی حیثیت بلاشبہ مسٹر ممتاز محمد خاں دولتانہ اور ان کے ساتھیوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ اگرچہ کچھ دوسرے گروپوں کا دعویٰ بھی اس بات میں بالکل بے بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا)۔

قصہ مختصر یہ کہ..... اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں تحریکِ پاکستان کے احیاء کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے لیکن چونکہ تحریکِ پاکستان کے حصے بخرے ہو چکے ہیں اور ع

"اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے"

کے مصداق اس کی وراثت کے مدعی بہت سے ہیں، لہٰذا چاہے۔ "تحفّظِ نظریۂ پاکستان" کے نام پر بھیک کسی ایک جماعت ہی کو زیادہ مل جائے، انتخابات کے میدان میں تحریکِ پاکستان کے اس حالیہ احیاء کے ثمرات بہت سی سیاسی جماعتوں کے مابین تقسیم ہوں گے اور کوئی ایک جماعت چاہے وہ کوئی سی بھی ہو ان سے بلاشرکتِ غیرے متمتّع نہیں ہو سکتی!.....!!

(ماخوذ 'میثاق'، جون جولائی ۱۹۷۰ء)

جمہوریت، سوشلزم اور اسلام

(میثاق، جنوری، فروری، اور مارچ ۱۹۶۹ء کے اداریوں سے اقتباسات)

اصل نوعیتِ مسئلہ "ہمارے نزدیک اس وقت ملک کی داخلی سیاست کے اصل بنیادی مسائل دو ہیں۔ ایک یہ کہ سیاسی اختیارات..... جو مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر عوام کے بجائے نوکر شاہی کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔ وہ اختیار و اقتدار کے اصل مالکوں یعنی جمہور کو منتقل کئے جائیں اور دوسرے یہ کہ دولت اور خصوصاً ذرائع پیداوار جو عوام الناس کے بجائے ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری بن گئے ہیں انہیں پوری قوم میں عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے..... گویا کہ پہلی 'سلطانیٔ جمہور' کے نظام کے واقعی اور حقیقی نفاذ کی کوشش ہے اور دوسری "دورِ سرمایہ داری" کے منحوس اثرات اور نقوشِ کہن کو مٹانے کی سعی و جہد ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی کوششیں درست بھی ہیں اور مبارک بھی! اور ملک کے ہر ذی شعور شہری کا فرض ہے کہ وہ ان میں اپنی اپنی صلاحیت، استعداد اور قوتِ کار کے مطابق حصہ لے۔ اسلام کے نزدیک یہ دونوں ہی مقاصد محمود ہیں۔ اسلام ایک طرف اسے بھی گوارا نہیں کرتا کہ بندگانِ خدا کی گردنوں پر کوئی ایک فرد یا کچھ افراد یا کوئی مخصوص طبقہ خدائی کا تخت جما کر بیٹھے..... اور دوسری طرف عدل و انصاف پر بھی انتہائی زور

دیتا ہے۔ چنانچہ " وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ "[1] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں سے ہے اور " لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ "[2] کتابِ الٰہی کا مقصد نزول ہے اور " دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ "[3] کی کوئی صورت اسلام کے نزدیک کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں۔

لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں اس وقت ان دونوں ہی میں شدید افراط و تفریط سے کام لیا جارہا ہے۔ دائیں بازو کے اہلِ سیاست نے صرف پہلے کام پر نگاہوں کو مرکوز کر دیا ہے اور دوسرے معاملے کے ضمن میں وہ 'وعدہ فردا' سے آگے قدم بڑھانے کو تیار نہیں اور مزید بدقسمتی یہ کہ 'سلطانیٔ جمہور' کے ذیل میں بھی ان کے سارے تصورات یورپ کے مبنی بر الحاد فکر سے مستعار لئے ہوئے ہیں..... دوسری طرف بائیں بازو کے حامی لوگوں نے اپنی اصل توجہ دوسرے کام پر مرکوز کر دی ہے اور 'عدلِ اجتماعی' کے لئے نظام بھی ان کے پیشِ نظر خدا تعالیٰ کا عطا کردہ نہیں 'مارکس' 'لینن اور ماؤزے تنگ کا وضع کردہ ہے.....!!

> اس صورت حال میں ہر اُس شخص کے لئے جو اوّل و آخر صرف مسلمان ہو اور جس کے نزدیک دین و مذہب ہر چیز پر مقدم ہوں ایک اہم لمحۂ فکریہ ہے..... ایسے سب لوگوں کو خواہ وہ موجودہ سیاسی سرگرمی میں کسی حیثیت سے شریک ہوں 'خواہ کسی خالص غیر سیاسی کام میں مصروف ہوں اس صورت حال کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہئے اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے مدِّ نظر دین کے احیاء اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے مناسب لائحۂ عمل طے کر کے اس پر عمل پیرا ہو جانا چاہئے۔
>
> یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!"

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق جنوری ۱۹۶۹ء)

---

[1] سورۃ شوریٰ۔ رکوع ۱' ترجمہ "اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے مابین انصاف کروں!"

[2] سورۃ حدید۔ رکوع ۳' ترجمہ "تاکہ لوگ عدل و انصاف کے نظام پر قائم رہیں!"

[3] سورۃ حشر۔ رکوع ۱' ترجمہ "(سرمائے) کا الٹ پھیر اہلِ ثروت ہی کے مابین!"

(۱۱)

خواہ مخواہ کا بپتسمہ اور فتووں کا تکلّف حال ہی میں جمعیت علمائے اسلام کی پاکستان میں نشأۃِ ثانیہ کے اصل معمار مولانا غلام غوث ہزاروی کے ایک بیان پر جو لے دے ہوئی ہے اس سے یہ بحث زور شور کے ساتھ شروع ہوگئی ہے کہ آیا سوشلزم کا اسلام کے ساتھ پیوندلگ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم نے گذشتہ شمارے میں جمعیت کے بارے میں جو تفصیلی رائے پیش کی تھی' مولانا غلام غوث صاحب کے اس بیان سے اس کے اہم ترین جزو کی تصدیق ہوگئی۔ مولانا کے اس بیان کا اصل تعاقب حلقۂ دیوبندہی کے ان علماء کی جانب سے ہوا ہے جنھوں نے ماضی میں تحریکِ مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ ان حضرات کی ہمارے دل میں واقعتاً بڑی عزت ہے لیکن انہوں نے سوشلزم کو اسلام کی عین ضد اور جمہوریت کو عینِ اسلام ثابت کرنے کے لئے جس قسم کے دلائل دیئے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے بھاری بھرکم لوگوں کی جانب سے اور ایسی بچکانہ باتیں۔[1]

> اسلام بلاشبہ اپنی ذات میں ایک مکمل نظام ہے اور اساسی عقائد و نظریات سے لے کر حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کی تفصیلی تشکیل تک اس کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے جو کسی دوسرے نظریئے یا نظام کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا۔

---

[1] اس میدان میں اول اول تو مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی تشریف لائے تھے لیکن انہوں نے دعووں ہی پر اکتفا کی' دلائل کوئی نہ دیئے..... اس کے بعد جب ایک موقع پر اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے داعیٔ اعظم اور دورِ جدید میں اسلام کے مفکرِ اعلیٰ نے جمہوریت کے عینِ اسلام ہونے کے لئے یہ دلیل ارشاد فرمائی کہ "ہماری فقہ کی کتابوں میں جمہور کی اصطلاح کا بکثرت استعمال ہوا ہے!" تب تو واقعہ یہ ہے کہ "ناطقہ سر بگریباں" ہو کر رہ گیا..... کہ اب کوئی کیا کہے اور کیا لکھے..... اس لئے کہ کہنے سننے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی..... البتہ اس قدر گزارش کئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا کہ حضرت! اگر اسی اصول پر کسی نے یہ دلیل دے دی کہ چونکہ ہماری فقہ کی تمام کتابوں میں "شراکت" پر مستقل باب موجود ہیں لہٰذا "اشتراکیت" بالکل درست اور از روئے اسلام بالکل جائز ہے تو کس بھاؤ تلے گی؟"

چنانچہ نہ اس کے کسی جزو کا پیوند کسی اور نظام کو لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور نظام کے کسی جزو کی پیوند کاری اس کے ساتھ ممکن ہے۔ لیکن اگر اس بنا پر کہ اس کے سیاسی و انتظامی ڈھانچے کے بعض اجزاء جمہوریت کے بعض اجزاء سے جزوی مشابہت رکھتے ہیں، اس کا تعلق جمہوریت کے ساتھ قائم کیا جا سکتا ہے تو یقیناً اس کے معاشی نظامِ عدل وقسط کے بھی بعض اجزاء سوشلزم کے بعض اجزاء سے مطابقت رکھتے ہیں اور اس بنا پر اسلام کا رشتہ سوشلزم کے ساتھ بھی ممکن ہے..... بلکہ ہمیں یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ خلافتِ راشدہ میں خلیفہ کی ذات میں اختیارات کا جس قدر ارتکاز تھا اس سے مشابہت کی بنا پر آمریت کا رشتہ بھی اسلام کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے..... ! اسلامی نظامِ معیشت و حکومت کا عروج یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا اور اس میں جہاں جمہوریتِ کاملہ کے ایسے مظاہر دیکھنے میں آتے تھے کہ ایک عام مسلمان ان کو برسرِ منبر ٹوک دیتا تھا وہاں ان کے سفرِ بیت المقدس میں سوشلزم کی بلند ترین منزل کی شان بھی موجود ہے۔

ویسے ہمارے نزدیک ان دونوں ہی کے ساتھ اسلام کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرنا نرا تکلّف ہے۔ ہمارے ہاں نہ حامیانِ جمہوریت، جمہوریت کے داعی اس لئے بنے ہیں کہ انہیں اسلام کی بارگاہ سے اس کا حکم ملا ہے اور نہ ہی سوشلزم کے حامی اس کی جانب اس لئے جھکے ہیں کہ انہیں اسلام کا تقاضا یہی معلوم ہوا..... یہ سب کچھ تو تاریخ کے ایک عام بہاؤ کے تحت ہو رہا ہے جو گذشتہ دو تین صدیوں سے خالصتاً غیر مذہبی و لادینی رخ پر بہہ رہا ہے اور جس میں مذہب سے سرے سے کوئی بحث (REFRENCE) ہی نہیں حامیانِ دین و مذہب کی اس عام بہاؤ کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کو پیتسمہ دینے کی کوشش بالکل خواہ مخواہ ہے.....!

موٹی سی بات ہے کہ فکر و فلسفے کے اعتبار سے موجودہ پوری دنیا کا امام تا حال یورپ ہے۔ اور جو خالص بے خدا و مادّہ پرستانہ تہذیب وہاں سے اٹھی تھی وہ تا حال پورے کرۂ ارضی پر حکمران ہے، وہاں کے ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کی

کو کھ سے خالص تاریخی عوامل کے زیرِ اثر جو جمہوری نظام بر آمد ہوا تھا اس نے اولاً سیاسی شعبۂ زندگی میں جمہوریت (DEMOCRACY) کی صورت اختیار کی۔ جس کے مختلف ممالک میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے۔ اسی جمہوریت نے بعد میں معاشی نظام میں آزاد معیشت کی راہ سے سرمایہ داری (CAPITALISM) کی کریہہ صورت اختیار کر لی جس کا ردِّ عمل سوشلزم اور کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا' جو در حقیقت نظریہ و فکر کے اعتبار سے اسی قدیم لادینی مادہ پرستانہ سلسلۂ فکر کی اگلی منطقی کڑی اور نظام کے اعتبار سے سرمایہ داری کا قدرتی ردِّ عمل ہے..... اس ردِّ عمل کے بھی مختلف ملکوں میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے اور اس میں مادر پدر آزاد معیشت کی تباہ کاریوں کی روک تھام میں انسان نے ایک دوسری انتہا پر پہنچ کر فرد کی آزادی کو بالکل سلب کر کے اسے اجتماعیت کے کاملۃً بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ اس کے باوجود چونکہ اس صورت میں بھی انسان اپنے اوپر کسی اور بالاتر اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا سوشلزم کے تمام ایڈیشن بھی چاہے وہ روسی ہوں یا چینی مدّعی جمہوریت ہی کے ہیں..... چنانچہ اس وقت عالمی کمیونسٹ تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ملک بھی "عوامی جمہوریۂ چین" ہی کہلاتا ہے.....!!

> سیاسی و معاشی نظاموں کے انقلابات کا یہ سلسلہ اوّلاً تو صدی ڈیڑھ صدی میں تکمیل کو پہنچا تھا لیکن اب دنیا کے تمام تر زیرِ ترقی ممالک میں یہ داستان بڑی تیزی کے ساتھ دوہرائی جا رہی ہے اور یہ حالات کا ایک خالصتاً اپنا رخ ہے جو کسی مرحلے پر بھی دین ومذہب سے کوئی فتویٰ طلب نہیں کرتا۔ مفتیانِ دین ومذہب خواہ مخواہ اس کے مختلف موڑوں پر اپنے دار الافتاء سے فتوے صادر کرنے کا تکلّف کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان بھی ایک نیم ترقی یافتہ اور نیم پس ماندہ ملک ہے اور اس میں بسنے والے عوام بھی ایک نیم خوابیدہ و نیم بیدار قوم ہیں۔ اس نیمے دروں و نیمے بروں حالت میں جتنے دوسرے ممالک مبتلا ہیں' عام اس سے کہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم' جو کچھ وہاں ہو رہا ہے وہی یہاں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے..... اور ہوتا رہے گا۔ جب تک کہ دین ومذہب اس معاشرے میں واقعتاً ایک مؤثر عامل کی حیثیت اختیار نہ کر لیں..... جس کے امکانات بحالاتِ موجودہ دُور دُور تک نظر نہیں آتے!!

ہمارے اس وقت کے جملہ اجتماعی مسائل کی اصل صورت یہ ہے کہ :

۱۔ آج سے اکیس سال قبل آزادی کی صورت میں دفعتہً جو سیاسی حقوق و اختیارات ہمارے ہاتھ آئے ہم بحیثیت قوم اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے اور چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ یہ حقوق و اختیارات عوام کے ہاتھوں تک کبھی پہنچے ہی نہیں' بیچ ہی میں کچھ جاگیرداروں (FEUDAL LORDS) اور کچھ سابق حکمرانوں کی تربیت دادہ سروسز (SERVICES) نے انہیں اچک لیا۔ خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ عوام اس کے لئے تیار نہ تھے لہٰذا رفتہ رفتہ یہ اختیارات پہلے چند پیشہ ور سیاست دانوں اور پھر ان کے بھی نا اہل ثابت ہوجانے پر کلیتہً سروسز کو منتقل ہوگئے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے اور اس کا ردِّعمل عوامی جمہوریت کی بحالی یا از سرِ نو قیام کی کوششوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

۲۔ آزادی کے وقت ہمارا ملک ایک خالص زرعی ملک تھا۔ اور ان اکیس سالوں کے دوران رفتہ رفتہ صنعت نے ترقی کی تا آنکہ اب ہم ایک نیم زرعی و نیم صنعتی ملک بن چکے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ سارا کام مغرب سے مستعار لئے ہوئے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے تحت ہوا ہے۔ لہٰذا ہمارے یہاں بھی سرمایہ داری اپنی کریہہ ترین صورت میں ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ چنانچہ ملک کی زرعی دولت پر جو اجارہ داری پہلے سے قائم تھی اس میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملک کی پوری صنعت و تجارت پر بھی چند خاندانوں کا قبضہ ہوگیا ہے..... اس کے ردِّعمل کے طور پر یہاں بھی وہی کچھ سوچا جارہا ہے جو دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں سوچا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ کہ تقسیمِ دولت اور ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت کے پورے نظام کو بیخ و بن سے اکھیڑ ڈالا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں ردِّعمل تاریخ کے متذکرہ بالا عمومی بہاؤ ہی کے اجزاء ہیں اور ان میں سے کسی کا بھی کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں.....!!

لیکن چونکہ اتفاقاً ہمارے ملک کے عوام کو مذہب سے ایک جذباتی سا تعلق بھی ہے لہٰذا اس غریب کا نام خواہ مخواہ اچھالا جاتا ہے۔ خود تحریکِ پاکستان کے دوران بھی جس کے اصل اساسی عوامل معاشرتی و معاشی تھے' اس کا نام زور شور سے لیا گیا اور پاکستان کا مطلب ہی "لا الٰہ الا اللہ" بتایا گیا جس کی حقیقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ربع صدی گزر جانے کے باوجود اس غریب اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نام نشان یہاں نظر آتا ہے جتنا ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ بلکہ ہمارے اندازے کے مطابق اس سے بھی کم..... اور اب

بھی مختلف عمرانی نظریات کے حامل لوگ خواہ مخواہ اس کا نام بدنام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں.....!

(ماخوذ از "تذکرہ وتبصرہ" میثاق فروری ۱۹۶۹ء)

(iii)

شریعتِ اسلامی میں دستوری اور معاشی مسائل کے حل کے لئے وسیع گنجائشیں موجود ہیں

سوچنا چاہئے کہ اس وقت جو مسائل بالعموم ملک اور قوم کے سامنے ہیں ان میں سے آخر کون سے مسئلے کا کوئی خاص تعلق دین ومذہب سے ہے؟ طرزِ حکومت وحدانی ہو یا وفاقی، جمہوریت صدارتی ہو یا پارلیمانی، انتخابات بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ، مغربی پاکستان ایک صوبہ رہے یا دوبارہ متعدد صوبوں میں منقسم ہو جائے، جس طرح ان تمام مسائل میں اسلام کا کوئی ایک منصوص حکم نہیں ہے بلکہ حالات وضروریات کے اعتبار سے مناسب صورتیں اختیار کرنے کی بڑی گنجائش ہے کہ زمین کا بندوبست کن بنیادوں پر ہو اور بڑی بڑی صنعتوں اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت برقرار رکھی جائے یا انہیں اجتماعی ملکیت قرار دے کر حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مزارعت کا مسئلہ ہمارے یہاں سلف سے متنازعہ فیہ چلا آرہا ہے اور حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کو مجاہدین کے مابین تقسیم کرنے کی بجائے پوری ملّتِ اسلامی کی اجتماعی ملکیت قرار دے کر ایک اہم اجتہاد فرمایا تھا جس پر پوری امت کا اجماع بھی ہو گیا تھا لہٰذا ان مسائل میں دلیل کی بنیاد پر کوئی ایک یا دوسرا موقف تو اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اپنی کسی رائے کو اسلام کا حتمی فیصلہ قرار دے کر بقیہ آراء کو کفر والحاد قرار دے دینا یقیناً زیادتی اور حدود سے تجاوز ہے۔ ہماری رائے میں بالکل صحیح کہا ہے مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مسائل ومعاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور مشکلات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے اور ان کے حل کی مخلصانہ کوشش کی جائے نہ یہ کہ جو بھی ذرا عام روش سے ہٹ کر بات کرے اس کے خلاف کفر والحاد کے فتووں کی توپیں داغنی شروع کر دی جائیں.....!!

پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کے علمبردار اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اب پھر بس قبل از مارشل لاء

کی سی جمہوریت ملک میں دوبارہ قائم ہو سکتی ہے اور بالکل اسی طرح کے سے حالات لوٹ کر آسکتے ہیں تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اس ملک میں اب حقیقی عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور جمہور اب صرف اس بات پر کبھی قانع نہ ہوں گے کہ ان کو 'ووٹ' کی صورت میں سرمایہ داروں سے کچھ 'نوٹ' حاصل کرنے کا ایک کاغذی ساحق مل جائے بلکہ وہ اپنے تمام سیاسی و معاشی حقوق کے حصول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس صورتِ حال میں اگر کسی نے مذہب کو ان کے خلاف دلیل کی حیثیت سے استعمال کیا تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ کہ مذہب کے ساتھ عوام کا رہا سہا تعلق بھی ختم ہو جائے گا اور مذہب سے بیزاری کی عام رو چل نکلے گی۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ہوشمند لوگوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق مارچ ۱۹۶۹ء)

ہر قسم کے بال بیرنگز کے مرکز

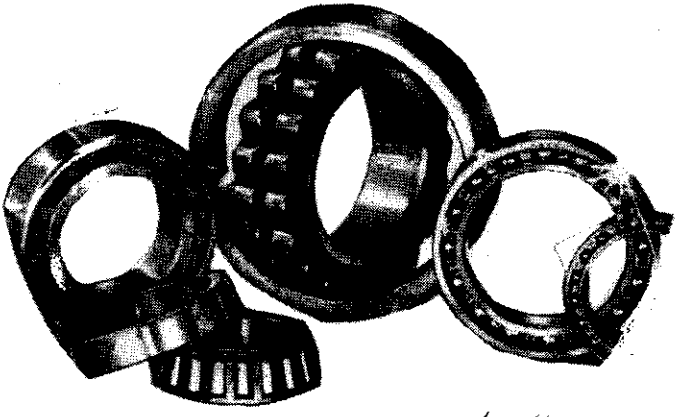

سندھ بیرنگ ایجنسی، ۶۵ منظور اسکوائر پلازہ کوارٹرز۔ کراچی۔ فون: ۷۲۳۳۵۸، ۷۲۱۱۷۲

خالد ٹریڈرز۔ بالمقابل کے۔ ایم۔ سی ورکشاپ۔ نشتر روڈ۔ کراچی

فون: ۷۳۵۸۸۳ — ۷۳۲۹۵۲ — ۳۰۵۹۵

پاکستان کی مذہبی سیاست کی بے بسی اور بے راہروی اور کرنے کا اصل کام

(تذکرہ وتبصرہ، میثاق، فروری ۱۹۶۹ء و اکتوبر ۱۹۷۰ء کے اقتباس)

(۱)

جماعتِ اسلامی کی مذہبی سیاست کی بے بسی اور کرنے کا اصل کام:

جمعیت علماء اسلام کا ذکر تو اس وقت رہنے دیجئے اس لئے کہ وہ پاکستان کی موجودہ سیاست کے میدان میں فی الحال نووارد ہے اور ابھی اس کی سیاست کے خطوط بالکل مبہم ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ این اے پی اور پی پی پی کے دوش بدوش نظر آتی ہے اور کبھی پی ڈی ایم سے اشتراک کرتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی ایک پلڑے میں وزن ڈالتی ہے کبھی دوسرے میں.....!

البتہ جماعت اسلامی اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ اسے پاکستان کی سیاسیات میں برسرِ عمل ہوئے پورے اکیس سال بھی ہو چکے ہیں اور اس پورے عرصے میں وہ اس امر کی مدّعی بھی رہی

ہے کہ اس کا اصل مقصد احیائے اسلام اور اقامتِ دین ہے!

ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس پورے سفر کے دوران اس کی دینی و مذہبی حیثیت اگر کوئی تھی بھی تو کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو چکی ہے اور وہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ موڑنے کی بجائے خود متذکرہ بالا تاریخی بہاؤ کے رخ پر بہہ نکلی ہے.....! اور اب چاہے ایک مضبوط اور منظم گروہ کی حیثیت سے ملکی سیاست کے میدان میں اس نے اپنا کوئی وقار قائم کر بھی لیا ہو۔ دینی و مذہبی حیثیت سے اس کی سرے سے کوئی اہمیت باقی نہیں رہی.....!

پاکستانی سیاست کے افق پر اوّل اوّل جماعتِ اسلامی بڑے اعتماد اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تحریکِ پاکستان ہی کے جذباتی پس منظر کو اجاگر کر کے اور "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الّا اللہ" کے خالص مسلم لیگی نعرے کو اپنا کر 'اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے نام پر پردہ انقلابِ قیادت کی مہم تنہا اپنے بازو کے بل پر بہت جلد سر کر لے گی۔ چنانچہ اُس وقت اگر کسی اور نے اس کو تعاون و اشتراک کی پیش کش بھی کی تو اس نے نہایت حقارت کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا۔

لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ مسئلہ اتنا آسان نہیں اور تنہا اپنے زورِ بازو سے کام نہیں چل سکے گا تو جماعت نے مذہب ہی کے نام پر علماء اور مذہبی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک عرصے تک جماعتِ اسلامی کی مذہبی سیاست "علمائے متحدہ و متفقہ مطالبات" کی بنیاد پر چلتی رہی۔

لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد پھر محسوس ہوا کہ چڑھائی بہت سخت ہے اور گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو ایک قدم اور نیچے اتر کر خالص "جمہوریت" کے نعرے پر سیاست کی نئی بساط بچھائی گئی جس پر تا حال سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے.....!!..... اور جس کا مظہرِ کمال یہ ہے کہ "ڈی اے سی" جس میں پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے دونوں مذہبی پہلوان اس وقت مجتمع ہیں 'اس کے مطالبات اور متفقہ نکات میں غریب اسلام کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں!

خدا شاہد ہے کہ ہمارے پیشِ نظر کسی جماعت کی تنقیص ہرگز نہیں۔ ان گزارشات سے ہمارا مقصد صرف اپنی اس رائے کی وضاحت ہے کہ موجودہ سیاست کا دین و مذہب سے قطعاً کوئی تعلق نہیں اور وقت کا جو دھارا خالص غیر مذہبی و لادینی رخ پر بہہ رہا ہے اس کی مختلف لہروں کی باہمی آویزش میں اسلام کا نام استعمال کرنا اور خاص طور پر اسے موجودہ بوسیدہ '

گلے سڑے اور ظالمانہ و استحصالی نظامِ معیشت کا پشت پناہ بنا کر کھڑا کر دینا اسلام کی دوستی نہیں اس کے ساتھ دشمنی ہے۔ تاریخ کے رخ کا جو "ڈان" ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے' اس کا رخ مذہب کی جانب موڑنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے فلسفہ و فکر کے میدان میں انقلاب برپا کیا جائے اور روحانی اقدار کا از سرِ نو احیاء ہو۔ ایمان و یقین کی روشنی دنیا میں پھیلے اور اخلاق و اعمال میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں۔ جب یہ انقلاب کسی انسانی معاشرے میں ایک معتدبہ حد تک رونما ہو چکے گا تب کہیں جا کر اس کا امکان پیدا ہو گا کہ اس کی سیاست بھی مذہب کے تابع ہو۔ اور وہاں خدا پرستانہ نظامِ زندگی پوری شان کے ساتھ جلوہ آرا ہو سکے..... ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ ان اعتبارات سے دین و مذہب کی روح سے بہت بعید ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا جن کا اصل تعلق اسلام اور صرف اسلام سے ہو اور جن کی زندگیوں کا مقصود صرف اور صرف احیائے اسلام و اقامتِ دین ہو' موجودہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا اپنی قوتوں' صلاحیتوں اور اوقات کو ضائع کرنا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ یہ کہ..... اگر علمی و فکری کام کرنے کی استعداد رکھتے ہوں تو تعلیم و تعلّمِ قرآن کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیں اور کتاب اللہ کے علم و حکمت کی تحصیل و اشاعت میں مصروف ہو جائیں۔ اس لئے کہ ایمان و یقین کے احیاء کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں..... اور اگر علمی کام سے مناسبت نہ رکھتے ہوں تو معاشرے کے کونوں کھدروں میں بیٹھ جائیں اور خلوص و اخلاص کی قوتوں کو بروئے کار لا کر عوام الناس میں دینی و روحانی اقدار کی از سرِ نو ترویج کی کوشش کریں۔

ہم تحریکِ پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا۔ لیکن پاکستان کے معجز نما ظہور..... اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقا کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور پورے عالمِ ارضی میں غلبۂ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے اور اسی بنا پر ہمیں اس کا بقا و وجود بھی عزیز ہے اور اس میں انتشار اور انارکی کسی صورت گوارا نہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس مبارک انقلاب کی ابتداء سیاسی میدان سے نہیں بلکہ علم و فکر اور فلسفہ و حکمت کے میدان سے ہو گی۔ اور ایک علمی و تعلیمی انقلاب کے سوا اس کی کوئی راہ موجود نہیں..... اس میدان میں بالکل ابتدائی اور کمیت کے اعتبار سے نہایت حقیر کوشش کئے چلے جانا بھی چاہے اس کے کوئی محسوس نتائج سامنے نہ آئیں۔ ہمارے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ سیاسی میدان میں

بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شرکت کی جائے۔ لیکن بجائے اس کے رخ کو دین و مذہب کے جانب موڑنے کے خود اس کی رو میں بہہ جایا جائے!۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے !!

اللہ تعالیٰ ہمیں مسلمان جینے اور ایمان پر مرنے کی سعادت نصیب فرمائے..... آمین!

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق فروری ۱۹۶۹ء)

(۲)

علماء کرام اور جماعتِ اسلامی کی مذہبی سیاست کا تاریخی جائزہ

پاکستان کے سیاسی حالات نے اواخر ۱۹۶۸ء سے جو پلٹا کھانا شروع کیا تھا اس کی تیزی اور تندی کو تو اگرچہ سابق صدر ایوب اور حالیہ صدر یحییٰ کی حکمت عملی نے بہت حد تک روک دیا تاہم وہ تبدیلی اندر ہی اندر دھیمی چال اور مدھم آواز کے ساتھ مسلسل جاری ہے اور اس کے اثرات صرف سیاسی میدان ہی تک محدود نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ اس سے تدریجاً متاثر ہو رہا ہے، حتیٰ کہ صرف دو پونے دو سال میں حالات اس قدر بدل چکے ہیں کہ پہلی بہت سی باتیں بالکل بھولی بسری یادیں معلوم ہوتی ہیں..... اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان دو سالوں میں ہم کم از کم بیس سال کی مسافت قطع کر آئے ہیں۔

دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر..... صرف "مذہبی سیاست" کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اواخر ۱۹۶۸ء سے قبل اور مابعد کے حالات میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ اور اس کے مقدمات و مبادی اور صغریٰ کبریٰ سمیت ساری منطق تبدیل ہو گئی ہے۔

پاکستان کے پہلے اکیس سالوں کے دوران میں ہماری مذہبی سیاست میں کامل اتحاد اور اتفاق کا سماں بندھا رہا اور مولانا مودودی، مولانا تھانوی یہاں تک کہ مفتی محمود اور مولانا ہزاروی ا۔..... ایک ہی راگ الاپتے اور ایک ہی منطق کے چپوؤں سے مذہبی سیاست کی ناؤ

ا۔ غور فرمایئے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ کس قدر عجیب نظر آتا ہے کہ کبھی کسی مرحلے پر مولانا مودودی اور مولانا ہزاروی ایک ہی کشتی میں سوار رہے ہیں اور دونوں کی حکمت عملی ایک ہی رہی ہے!

کھیتے رہے۔

اس منطق کا صغریٰ کبریٰ یہ تھا کہ..... (۱) پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے..... اور (۲) پاکستان کے عوام کی ایک عظیم اکثریت (نو سو ننانوے فی ہزار کی حد تک!) اسلام ہی کی فدائی اور شیدائی ہے اور اسلامی قانون و دستور ہی کا نفاذ چاہتی ہے..... (۳) صرف ایک "برسرِاقتدار طبقہ" ہے جو قوم کے اس ارادے کی راہ میں مزاحم ہے۔ اور ملک کو دستوری اعتبار سے لادینیت اور تہذیبی و اخلاقی اعتبار سے بے حیائی اور اباحیت پرستی کی راہ پر چلانا چاہتا ہے (۴) لہٰذا ساری اجتماعی جدّوجہد کا رخ ان "ارباب اقتدار" اور اس "برسرِاقتدار طبقے" کے خلاف ہونا چاہئے۔ اور نہ تو قوم کو ان سے بدظن کرنے کی کوشش میں کوئی کمی رہنے دینی چاہئے اور نہ ہی ان کے خلاف بے چینی اور بے اطمینانی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے چوکنا چاہئے۔

چنانچہ ان پورے اکیس سالوں کے دوران ہماری تمام مذہبی قوتیں چاہے وہ جماعتیں تھیں یا جمعیتیں ایک ہی ہدف پر حملے کرتی رہیں اور تحریر و تقریر کا سارا گولہ بارود ایک ہی نشانے پر صرف ہوتا رہا..... یہ دوسری بات تھی کہ یہ قلعہ تھا خالص ہوائی۔ اس لئے کہ نہ تو کبھی "اربابِ اقتدار" اور "برسرِاقتدار طبقہ" کی واضح تعریف کی جاسکی اور نہ ہی اس کا حدود اربعہ متعیّن کیا جاسکا.....

عوام کے بارے میں چونکہ متذکرہ بالا صغریٰ کبریٰ کی رُو سے یہ بات طے شدہ تھی کہ وہ تو اسلام کے فدائی اور شیدائی ہیں ہی لہٰذا ان کے ذہن و فکر کی تطہیر اور ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کا سوال منطقی طور پر خارج از بحث رہا۔ اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ ان کی طرف سے خطاب کا رخ بالکل پھر گیا۔ گویا ان سے تو کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ کہنا تو جو بھی کچھ تھا وہ ان کے انگوٹھوں، دستخطوں اور قراردادوں کے بل پر "اربابِ اقتدار" سے تھا!

اس سیاست کا عظیم ترین شاہکار ۱۹۵۳ء کی "انٹی قادیانی موومنٹ" تھی جو شروع تو اگرچہ مجلسِ احرارِ اسلام اور جمعیت علمائے ہند کے باقیات الصالحات نے کی تھی لیکن جس میں بعد میں اضطراراً جماعت اسلامی کو بھی اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت شریک ہونا پڑا..... اس موومنٹ کا نقد نتیجہ (NET RESULT) یہ نکلا کہ "ارباب اقتدار" کے طبقے سے نسبتاً مخلص اور دیندار عناصر کو دیس نکالا مل گیا اور ملکی سیاست کی باگ ڈور زیادہ شاطر اور عیار لوگوں کے ہاتھ میں آگئی اور پھر وہ افراتفری مچی جس کے نتیجے میں بالآخر فوجی حکومت قائم ہو کر رہی۔

دورِ ایوبی کے اواخر میں مذہبی سیاست نے پھر طاقت پکڑنی شروع کی اور اس بار اس نے دو کامیاب چھاپے مارے۔ ایک اوائل ۱۹۶۷ء میں عیدالفطر کے موقع پر اور دوسرے اواخر ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر فضل الرحمان کے خلاف ایجی ٹیشن برپا کر کے۔ ان دونوں مواقع پر بھی ملک کے تمام مذہبی عناصر بالکل متحدّ تھے اور بالکل ایسا سماں بندھ گیا تھا کہ ایک طرف حکومت اور برسرِاقتدار طبقہ ہے..... اور دوسری طرف تمام علماء اور رجالِ دین۔ گویا یہ پاکستان کی مذہبی سیاست کی متذکرہ بالا منطق کا نقطۂ عروج تھا.....!!

لیکن افسوس کہ مذہبی سیاست کے اس عروج کو ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود!" کے مصداق نہایت مختصر عمر ملی اور اواخر ۱۹۶۸ء سے ملکی سیاست ایک بالکل ہی نیا موڑ مڑ گئی۔

اس نئے موڑ کے یوں تو متعدد پہلو ہیں لیکن مذہبی سیاست جس پہلو سے سب سے زیادہ متأثر ہوئی وہ یہ ہے کہ چونکہ ایک طرف سیاسی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور دوسری طرف موجودہ فوجی حکومت نے کسی مستقل حکومت کی شکل اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی اور کم از کم تا حال اس نے ایک خالص عبوری اور CARE-TAKER قسم کی حکومت کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ لہٰذا "اربابِ اقتدار" اور "برسرِاقتدار طبقہ" ایسی اصطلاحات بے معنی ہو کر رہ گئیں اور اس طرح گویا وہ "ہوائی قلعہ" فضا میں تحلیل ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جس پر تمام مذہبی جماعتیں متحدا ور متفق ہو کر حملے کیا کرتی تھیں.....

نتیجتاً ایک جانب وہ اتحاد و اتفاق پارہ پارہ ہو گیا جس کی بنیاد حبِّ علیؓ کی مثبت اساس کے بجائے بغضِ معاویہؓ کی منفی بنیاد پر قائم تھی..... چنانچہ دو سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور مذہبی جماعتیں یعنی جماعتِ اسلامی اور جمعیتِ علماء اسلام ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئیں۔ اور دوسری طرف تصادم کا میدان بدل گیا..... اور مقابلہ "رجالِ دین" اور "اربابِ اقتدار" کے مابین نہ رہا بلکہ اس نے عوامی سطح پر مختلف جماعتوں اور گروہوں کے مابین تصادم کی صورت اختیار کر لی۔ جس میں اصل جھٹہ بندی دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کے تحت ہو رہی ہے اور اصل وزن انہی دو پلڑوں میں ہے اور مذہبی جماعتیں پاسنگ کی حیثیت سے ان دونوں اطراف میں بلاواسطہ یا بالواسطہ وزن ڈالنے پر مجبور ہو رہی ہیں!

خالص نظریاتی اعتبار سے تو پاکستانی سیاست کے موجودہ عبوری دور کو جلد ہی ختم ہو جانا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ آئندہ سال کے وسط تک انتخابات اور دستور سازی وغیرہ کے تمام مراحل طے ہو کر عوام کی نمائندہ حکومت کو قائم ہو جانا چاہئے..... لیکن عملاً جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ متذکرہ بالا مراحل میں سے ہر مرحلہ نہایت کٹھن ہے اور دستور سازی کی گھاٹی تو تقریباً ناقابل عبور ہی ہے..... بنابریں موجودہ عبوری دور مستقل نہیں تو کم از کم "عارضی مستقل" ضرور ہے'..... اور چاہے کسی کو پسند ہو یا ناپسند جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاصی طویل مدت تک پاکستان میں عوامی کشمکش ہی کا سلسلہ چلتا رہے گا اور "چار و ناچار" فوج ہی کو پاکستان کی سول ایڈمنسٹریشن کی نگرانی بھی کرنی ہوگی۔ گویا "برسراقتدار طبقہ" کا تصور اب ایک طویل عرصے تک مفقود رہے گا اور مذہبی جماعتوں کے اتحاد و اتفاق کی یہ منفی اساس دوبارہ وجود میں نہ آ سکے گی!

تاہم کارکنوں کے لہو کو گرم رکھنا ایک ناگزیر جماعتی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایک ایسا ہدف بھی لازم ہے جس پر کارکن مسلسل جھپٹ کر پلٹتے اور پلٹ کر جھپٹتے رہیں۔ چنانچہ اب کی بار ایک جمعیت علمائے اسلام کو چھوڑ کر بقیہ تمام مذہبی جماعتوں نے اپنی مسلسل چاندماری کے لئے "سوشلزم" کا ہدف منتخب کیا ہے اور تمام مذہبی جماعتوں کے شعلہ بیان مقررین اپنا پورا زور خطابت اسی ایک محاذ پر صرف کر رہے ہیں اور اگرچہ مختلف مذہبی جماعتوں کوئی مختلف سیاسی جماعتوں سے علانیہ یا در پردہ سازباز کی بنا پر یہ آپس میں ہرگز متحد نہیں بلکہ اندر ہی اندر ایک دوسرے کی کاٹ میں مصروف ہیں' تاہم کم از کم ظاہری اعتبار سے ان سب کا مشترک ہدف "سوشلزم" ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ "برسراقتدار" طبقہ کی طرح یہ تازہ ہدف بھی ہے خالص ہوائی' اس لئے کہ ذرا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک میں سوشلزم کے علمبردار ہیں کون لوگ؟ جماعتِ اسلامی اور پی ڈی پی تو ہوئیں اصلی اور ٹھیٹھ اسلام پسند' تینوں لیگیں بھی اور چاہے جو کچھ بھی ہوں سوشلسٹ بہرحال نہیں' رہے مسٹر بھٹو تو خود وہ اگرچہ "اسلامی سوشلزم" کا راگ الاپتے ہیں لیکن ان کے تمام سیاسی مخالفین سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہرگز نہیں ہیں بلکہ یا تو سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں یا صرف ایک فاشسٹ نیشنلسٹ..... لے دے کے دو نیپیں (NAPS) رہ جاتی ہیں' جنہیں

سوشلسٹ کہا جا سکتا ہے۔ تو اول تو ان کا حلقۂ اثر ہے ہی کتنا کہ اس قدر شور و ہنگامہ اٹھانے کی ضرورت پڑ گئی پھر ان میں سے بھی ولی خاں گروپ بنیادی طور پر نیشنلسٹ ہے نہ کہ سوشلسٹ۔

ہاں ایک حقیقت ایسی ہے جسے مانے بغیر چارہ نہیں اور وہ یہ کہ اس ملک کے پڑھے لکھے طبقے..... اور خاص طور پر ان میں سے بھی ذہین تر عنصر میں سوشلسٹ خیالات قابل لحاظ حد تک موجود ہیں اور نوجوان نسل کا خاصہ قابل لحاظ حصّہ ذہنی اور فکری طور پر اس رو میں بہہ گیا ہے..... اور ان دونوں طبقات میں ایک اچھی بھلی تعداد ایسے مخلص انقلابی کارکنوں کی بھی موجود ہے جو اپنے پیشِ نظر انقلاب کے لیے کبھی ایک اور کبھی دوسرے سیاسی گروہ میں شامل ہو کر کام کرتے رہتے ہیں اور ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے یہ لوگ اس ملک میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تاہم اپنے جوش اور جذبۂ کار اور مخصوص انقلابی تیکنیک کے اعتبار سے یقیناً قابلِ لحاظ ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں بھی دو باتیں سوچنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ لوگ آخر آئے کہاں سے ہیں' ظاہر ہے کہ نہ روس سے درآمد ہوئے ہیں نہ چین سے..... بلکہ اسی سرزمین کی پیداوار اور اسی قوم کے افراد ہیں..... اور خاص طور پر ان کی اصل قوت یعنی نوجوان نسل تو ہے ہی قیامِ پاکستان کے بعد معرضِ وجود میں آنے والی' تو پھر ان میں اس ذہنی بے راہ روی کے پیدا ہونے کی ذمہ داری کس پر ہے..... اور کیا یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر ان لوگوں پر عائد نہیں ہوتی جو بزعمِ خویش اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی علمبرداری فرماتے رہے لیکن جنہوں نے تمام زور "برسرِاقتدار طبقہ" پر تنقید کرنے میں ضائع کر دیا اور قوتوں' صلاحیتوں اور اوقات کا سارا سرمایہ صرف سیاسی جدّوجہد کے نذر کر دیا اور تعلیم و تربیت کے کام سے یکسر نگاہیں پھیر لیں۔ چنانچہ نہ قوم کی ذہنی و فکری رہنمائی ہو سکی نہ اخلاقی و عملی تربیت' اور صورت یہ ہو گئی کہ نوجوان نسل میں سے جو جتنا زیادہ ذہین تھا اتنی ہی زیادہ تیزی سے الحاد و مادہ پرستی کی جانب جھکتا چلا گیا..... پھر اگر آج یہ نسل خالص مادہ پرستی کی عینک سے معاملات کو دیکھتی ہے تو آخر قصور کس کا ہے؟..... دوسرے مذہبی طبقات کو تو چھوڑیئے کہ سب ہی کا خیال ہے کہ ان میں جدید نسل کی ذہنی رہنمائی کی صلاحیت موجود نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے پاکستان کے تئیس سالوں کے دوران کیا کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک کو اتنی طویل مہلتِ کار کا مل جانا بڑی ہی غیر معمولی خوش قسمتی شمار کی جاسکتی ہے۔ اور تاریخ اس جماعت کا یقیناً شدید محاسبہ کرے گی جسے اتنی مہلت ملی لیکن اس نے اپنے آپ کو دور از کار معاملات میں الجھائے رکھا..... اور سیاسی سہمیں تو چلائیں لیکن نہ ذہن و فکر کی دنیا میں انقلاب برپا کیا اور نہ اخلاق و کردار کی وادیوں میں کوئی تبدیلی پیدا کی..... چنانچہ اب اپنی ہی "غفلتوں کی شاخسانوں" سے دوچار ہے!

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سیاسی ہنگامہ آرائی اور نعرہ بازی سے جیسی کہ آج کل مذہبی طبقات کی طرف سے "سوشلزم" کے مقابلے میں کی جارہی ہے کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اس لئے کہ یہ تو شاید ممکن ہو کہ اس طرح ان سیاسی جماعتوں کی پیش قدمی کو آپ کچھ دیر کے لئے روک دیں جو اپنی حصول اقتدار کی جنگ میں پیٹ کے نعرے کو اچھال رہی ہیں لیکن اس کی ہرگز کوئی امید نہیں کی جاسکتی کہ اس طریقے پر کسی ایک ذہن کو بھی بدلا جاسکے..... اور کسی ایک شخص کے فکر کے رخ کو بھی تبدیل کیا جاسکے۔ گویا یہ سارا "جہاد" ان لوگوں کے خلاف تو شاید کسی حد تک نتیجہ خیز ثابت ہو سکے جنہیں "PSEUDO SOCIALIST" کہا جاتا ہے، لیکن جو لوگ حقیقۃً سوشلسٹ ہیں اور جن کی زندگی کا مقصد ہی سوشلسٹ اور کمیونسٹ انقلاب برپا کرنا ہے اور جو واقعتاً موجودہ انقلابی رو کی ذہنی و فکری رہنمائی کر رہے ہیں ان کے خلاف یہ ساری مہم قطعاً لاحاصل اور بے کار محض ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز کی نعرہ بازی سے ایسے لوگ اپنے موقف پر مزید جازم اور اپنے نقطہ نظر میں مزید پختہ ہوتے چلے جارہے ہیں اور دین و مذہب کا رہا سہا اخلاقی وقار بھی خاک میں ملتا چلا جارہا ہے۔

ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہماری اس بار بار کی مرثیہ خوانی کا حاصل کچھ بھی نہیں اس لئے کہ ملکی سیاست کے میدان میں برسرِ کار مذہبی جماعتوں کے لئے اب طریق کار کی تبدیلی قطعاً ناممکن ہے۔ ان کی ایک بڑی تعداد تو جو کچھ کر رہی ہے اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ جن سے توقع ہو سکتی تھی وہ خود ہی اپنی غلط منطق کے صغریٰ کبریٰ کے جال میں اس درجہ پھنس چکے ہیں کہ اب اس سے ان کا رہائی پانا ممکن نہیں رہا۔ بنابریں اکثر گمان ہوتا ہے کہ ہماری ساری قیل و قال بیکار اور سعی لاحاصل ہے۔

لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کیا واقعی اتنے بڑے ملک اور اتنی عظیم قوم میں چند لوگ بھی ایسے

نہیں جو وقتی طور پر سیاست کے اتار چڑھاؤ سے صرفِ نظر کر کے دین و مذہب کی بنیادی اقدار کے احیاء کے لئے بالکل بنیادی اور اساسی کام میں منہمک ہو سکیں...... تو دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ غالباً ساری کمی ہمارے اپنے جذبِ دروں کی، اور اصل کوتاہی ہمارے بیانِ مطلب اور ادائے مدّعا کی ہے اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بارگاہِ ایزدی میں درخواست کی جائے کہ " ربِّ اشرح لی صدری و یسّرلی امری واحلل عقدةً من لسانی یفقهوا قولی......!"

ہمارے اسی باطنی اضطراب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بار بار خیال آتا ہے کہ "میثاق" کو بند کر دیا جائے تاکہ سیاسی میدان سے بالکل لاتعلق ہونے کے باوجود محض اس کے صفحات میں جو سیاسی تبصرے کبھی کبھی آجاتے ہیں ان کا سلسلہ بھی بند ہو جائے اور ہم اپنی صلاحیتوں کی حقیر سی پونجی کو کامل یکسوئی کے ساتھ صرف علومِ قرآنی کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلّمِ قرآن میں کھپا دیں۔ تاہم ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہو گا۔

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا   گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

(ماخوذ "میثاق"، اکتوبر ۷۰ء)

مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت

کے ضمن میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے پر ادارۂ 'تکبیر' کراچی کا محاکمہ اور ڈاکٹر صاحب کی وضاحت

۱۔ ہفت روزہ 'تکبیر' کراچی بابت ۲۱ تا ۲۷ فروری ۸۶ء کے ادارتی نوٹ کا عکس

طریقۂ بیعت، ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مودودیؒ

بانیٔ جماعتِ اسلامی کا اصل موقف ان کے مکاتیب کی روشنی میں

'تکبیر' کے گزشتہ شمارے میں تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا تھا، جس میں ڈاکٹر صاحب نے بیعت سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ مولانا مودودیؒ بھی نظامِ بیعت کے حامی تھے اور اس معاملہ میں ان کی فکر بالکل وہی تھی جو آج میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تشکیلِ جماعت سے ۱۰ ماہ قبل مولانا کی جانب سے حیدر آباد دکن کے محمد یونس صاحب کے نام مارچ ۱۹۴۱ء میں لکھے جانے والے ایک خط کا حوالہ دیا تھا۔ اس خط کے مکمل متن کا جائزہ لیا گیا تو ریکارڈ پر تشکیلِ جماعت سے ٹھیک ۱۰ ماہ بعد ۲۸ جون ۱۹۴۲ء کو انہی محمد یونس صاحب کے نام مسئلہ بیعت ہی پر مولانا محترم کا ایک دوسرا خط بھی موجود پایا گیا جس میں انہوں نے اپنا نقطۂ نظر بڑی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب شخصی بیعت کے داعی ہیں جبکہ مولانا مودودیؒ کا موقف یہ ہے کہ "بیعت کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو بلکہ اسلام کی طرف منسوب ہو تاکہ شخص خاص سے وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ جائے۔" ان کے نزدیک "اطاعت نظام کی ہونی چاہیے نہ کہ کسی شخص خاص کی۔"

ہمارے قارئین کی رہنمائی اور دلچسپی کے لئے مولانا مودودیؒ کے ان دونوں خطوط کا متن شائع کر رہے ہیں تاکہ وہ بیعت کے مسئلہ پر مولانا مودودیؒ کے نقطۂ نظر سے پوری طرح باخبر ہو سکیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور مولانا مودودیؒ کے موقف کا فرق ان پر واضح ہو جائے اور اس سلسلہ میں کسی غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہ رہے

۲۔ مولانا مودودی مرحوم کے خطوط (غیر متعلق حصے حذف کر دیئے گئے ہیں)

لاہور

مارچ ۱۹۴۱ء

محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاحاً جس بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لئے ہو لی ہو۔ جیسے بیعت رضوان تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ سن کر حضورؐ نے اہل مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہ کرامؓ سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ پیش آیدہ مہم میں آپ کے ساتھ جان فروشی کریں گے۔

۲۔ دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیت سے ایک مرشد و معلم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت تھی جو بالعموم اس شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبی کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبی کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقۂ نبوی کا صحیح علم بھی رکھتا ہو، اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً کوئی دوسری نیت نہ رکھتا ہو۔

۳۔ "تیسری بیعت وہ ہے جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطیع ہے۔ اس وقت تک جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ "من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ" اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان میں سے مراد تیسری بیعت ہے کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار آپؐ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

صوفیائے کرام میں جو بیعت رائج رہی ہے، وہ دوسری قسم کی ہے اور وہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص دین کا علم حاصل کرے اور احکام کو سمجھ کر ان کی پیروی کرنے کی کوشش کرے، بغیر اس کے کہ کسی روحانی مربّی کی بیعت اس کی گردن میں ہو، تو وہ نہ کوئی گناہ کرتا ہے نہ آخرت میں اس سے کوئی باز پرس اس امر کی ہوگی کہ اس نے کسی پیر کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑا۔ البتہ اگر کوئی دیندار، متبع شریعت، صاحبِ اخلاقِ فاضلہ شخص اس کو مل جائے جس کی زندگی کو دیکھ کر اسے یقین ہو جائے کہ فی الواقع وہ جانشینِ پیغمبرؐ ہونے کا شرف رکھتا ہے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لینا فائدہ سے خالی نہیں ہے بشرطیکہ بیعت کرنے والا خود بھی دین کا علم رکھتا ہو اور اپنے شیخ کا اندھا مقلد نہ ہو اور شیخ سے بشری کمزوری کی بناء پر اگر شریعت کے خلاف کچھ باتیں سرزد ہو جائیں تو مرید عقیدت مندی میں ان غلط باتوں میں بھی شیخ کی پیروی کرتا نہ چلا جائے۔ رہی موجودہ زمانہ کی پیری مریدی جس میں اصلاح و ارشاد کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا بلکہ بزرگوں کی گدیوں پر بیٹھ کر ان کے نالائق، بے علم، بداعمال جانشین اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ بناتے ہیں اور لوگوں کو اس دھوکہ میں ڈالتے ہیں کہ بس ہمارا ہاتھ پکڑ لینے کے بعد تمہارے لئے جنت واجب ہو جائے گی اور مریدوں سے اس طرح نذرانے وصول کرتے ہیں کہ گویا کہ وہ زمیندار ہیں اور اپنی اسامیوں سے لگان وصول کر رہے ہیں تو ایسی پیری مریدی کا واجب ہونا تو درکنار یہ جائز بھی نہیں ہے۔ یہ تو ایک معصیت

ہے۔ بلکہ میرے نزدیک اس کا شمار کبائر میں ہے۔ میں ان پیروں کو بدترین مجرم اور ان کے مریدوں کو سخت گمراہ سمجھتا ہوں۔ اگر میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی تو میں بجبر اس گمراہی کو روک دیتا۔

اعتقاد اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ غیر منفک تعلق رکھتی ہیں۔ اعتقاد نام ہے اس رائے یا خیال کا جس پر آدمی پختگی کے ساتھ قائم ہو۔ اور اس رائے یا خیال کے مطابق کام کرنے کا نام عمل ہے۔ ان دونوں کو ایک نہیں کہا جاسکتا، لیکن یہ دونوں مل کر ایک زندگی بناتے ہیں اور صحیح اعتقاد اور عمل میں مطابقت کا نام ہی اسلامی زندگی ہے۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

لاہور

۲۸ جون ۱۹۴۲ء

محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عنایت نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ کی غلط فہمی کسی حد تک رفع ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ ایک چیز تو طریقۂ بیعت وارشاد کی روح ہے اور دوسری چیز وہ خالص ہیئت و شکل ہے جس میں یہ طریقہ صدیوں سے متوارث چلا آ رہا ہے۔ جہاں تک اس کی اصلی روح کا تعلق ہے وہ بالکل برحق صحیح اور پاک ہے مگر جہاں تک اس کی ہیئت و شکل کا تعلق ہے وہ گمراہ کرنے والے پیروں اور جاہل مریدوں کے غلط طرزِ عمل کی وجہ سے اس قدر انحطاط کی شکار ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ کچھ دوسرے خراب لوازم اس قدر خلط ملط ہو گئے ہیں کہ اصل روح نہ صرف یہ کہ اس کے اندر باقی نہیں رہی بلکہ جہاں نیک نیت لوگ اس ہیئت و شکل میں کوئی صحیح خدمت بھی کرتے ہیں وہاں بھی بہت جلد ہی اس کے خراب لوازم عود کر آتے ہیں۔ اس بنا پر میری یہ رائے ہے کہ پیری مریدی کی وہ خاص شکل بدل دی جائے اور اس کے بجائے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں سلسلۂ بیعت وارشاد کی اصل روح تو موجود ہو مگر وہ خراب لوازم اور اتیلافات نہ ہوں۔ میں نے بہت غور و خوض کے بعد جو صورت تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اوّلاً ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت نہ لی جائے۔ بلکہ صرف زبانی عہد لیا جائے۔ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے لیا کرتے تھے۔ ثانیاً سلسلہ کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو۔ بلکہ "اسلام" کی طرف منسوب ہو تاکہ شخصِ خاص کی وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ سکے۔ ثالثاً تزکیۂ نفس اور اجرائے احکام اور اقامتِ نظم و انضباط وغیرہ کا کام جس شخص کے ہاتھ میں ہو وہ اس کی ذاتی حیثیت میں نہ ہو بلکہ جماعت کا سردار ہونے کی حیثیت میں ہو۔ حتیٰ کہ جب ایک شخص سردار نہ ہو اور دوسرا شخص اس کی جگہ آ جائے تو لوگوں کی اطاعت و وابستگی بھی پہلے شخص سے ہٹ کر دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو جائے۔ نہ یہ کہ لوگ اسی شخصِ خاص کے گرویدہ رہیں جس کے امر پر ابتدا میں انہوں نے عہد کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں خلفائے راشدین کے دور کی تنظیم سے میں نے اخذ کی ہیں۔ ان کے مبارک دور میں اسلامی جماعت اسلام کی طرف منسوب تھی نہ کہ صدیق رضؓ یا فاروق رضؓ یا عثمان رضؓ یا علی رضی اللہ عنہم کی طرف۔ اسی طرح لوگوں کی وابستگی شخصِ صدیقؓ یا شخصِ فاروقؓ سے نہ تھی بلکہ امیر المومنین سے تھی جو بھی وقت کا امیر ہو۔ اور اطاعتِ نظام کی تھی نہ کہ شخصِ خاص کی۔

آپ نے "جماعت اسلامی" میں اپنے آپ کو میرے درجہ کی ممبری کے لیے پیش کیا ہے اللہ آپ کو درجہ دوم بلکہ درجہ اول تک ترقی کرنے کی توفیق بخشے . . . .

خاکسار

ابوالاعلیٰ مودودی

۳۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی وضاحت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی مدیر 'تکبیر' ..... السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

'تکبیر' کی اشاعت بابت ۲۱ تا ۲۷ فروری ۸۶ء میں 'بیعت' سے متعلق میرے انٹرویو میں وارد شدہ ایک رائے کا محا کمہ مولانا مودودی مرحوم کے دو خطوط کے حوالے سے کیا گیا ہے..... اس ضمن میں یہ چند سطور پیش خدمت ہیں' جن کی حیثیت ایک جانب 'ذاتی وضاحت' کی ہے اور دوسری جانب ایک واقعاتی تحقیق کی۔ امید ہے آپ ان کی اشاعت کے لئے گنجائش نکال لیں گے۔

میرا تنظیم اسلامی کے لئے "بیعت" کے نظام کو اختیار کرنا ہرگز اس دلیل پر مبنی نہیں ہے کہ مولانا مودودی مرحوم اس کے قائل تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے علم میں مولانا کا موقف توافقاً آج سے صرف تین چار سال قبل حیدر آباد دکن کے مولانا محمد یونس مرحوم کے نام مولانا مرحوم کے کتابی شکل میں شائع شدہ خطوط کے ذریعے آیا۔ جبکہ میرا یہ ذہن کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کا تنظیمی ڈھانچہ "بیعت جہاد" اور "بیعت سمع وطاعت فی المعروف" کی اساس پر قائم ہونا چاہئے' جماعت سے علیحدہ ہونے کے دو سال بعد ہی اوائل ۱۹۵۹ء میں بن چکا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ میری ذاتی رائے تھی جسے میں اپنے بزرگوں پر کسی طرح مسلّط نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا جب ۱۹۶۷ء میں رحیم یار خان میں جماعت سے علیحدہ ہونے والے بعض حضرات کا اجتماع ہوا اور اُس میں ایک نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ ہو گیا اور اُس کے لئے تنظیمی ڈھانچہ طے کرنے کے لئے سات افراد پر مشتمل ایک مجلس مقرر کر دی گئی تو اگرچہ میں بھی اُن سات میں کا "ساتواں" تھا لیکن مجھے ہرگز یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ اس تنظیم کی اساس بیعت پر ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اُن سات افراد میں ہر اعتبار سے اوّلین اور اہم ترین شخصیت مولانا امین احسن اصلاحی کی تھی جن کے مزاج سے میں بخوبی واقف تھا تاہم میں چونکہ دوسرے مروّجہ طریق ہائے تنظیم کو بھی حرام نہیں بلکہ مباحات میں سے سمجھتا ہوں لہٰذا میں ذہناً اس کے لئے بالکل تیار تھا کہ نظام خواہ کوئی بھی ہو اگر اقامتِ دین کے لئے

طریق کار درست ہو تو لازماً شریک ہوں گا۔ ..... یہ دوسری بات ہے کہ یہ بیل منڈھے تو کیا چڑھتی سرے سے اُٹھ ہی نہ سکی' ..... اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں میں نے تنظیم اسلامی کے قیام کا فیصلہ کیا تو اس کے لئے قرار دادِ تاسیس بھی وہی رکھی جس پر ۱۹۶۷ء میں اتفاق ہوا تھا اور نظامِ جماعت کے معاملے کو بھی کھلا (OPEN) رکھا کہ تین سال تک میری حیثیت صرف داعی (CONVENOR) کی ہوگی ..... اور اس عرصے کے دوران جو حضرات قرار دادِ تاسیس پر اتفاق کرتے ہوئے جمع ہو جائیں گے وہ باہمی مشورے سے مستقل نظام طے کریں گے! ..... لیکن جب اڑھائی سال انتظار کے بعد بھی بزرگوں میں سے کسی نے پیش قدمی نہیں فرمائی تو بالآخر میں نے جولائی ۱۹۷۷ء میں ساتھیوں کے سامنے اپنا ذہن کھول کر رکھا۔ نتیجتاً "بیعت" ہی کو تنظیم کی مستقل اساس کے طور پر اختیار کر لیا گیا۔

اس کے بعد جب ۸۳۔ ۱۹۸۲ء میں "خطوط کے چراغ" نامی کتاب حیدر آباد دکن سے آئی اور اُس سے معلوم ہوا کہ مارچ ۱۹۴۱ء کے خط میں مولانا مودودی مرحوم نے بالکل وہی بات فرمائی تھی جس کا میں قائل ہوں تو اس پر فطری طور پر مجھے خوشی بھی ہوئی کہ ع "متفق گردید رائے بو علی با رائے من!" اور اپنی بات پر مزید اطمینان بھی ہوا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میرا موقف مولانا مرحوم کی رائے کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے مطالعہ کے مطابق قرآن حکیم اور سنّت و سیرتِ رسولؐ کی محکم اساسات اور اُمّت کے طویل تعامل پر قائم ہے!۔

البتہ جہاں تک علمی اعتبار سے مولانا مودودی مرحوم کے موقف کی تحقیق کا سوال ہے تو جو خطوط آپ نے شائع کئے ہیں ان میں حسب ذیل امور پر معروضی طور پر توجہ کی ضرورت ہے .....

(۱) ..... مولانا مرحوم کا مارچ ۱۹۴۱ء والا خط نہایت واضح ہے' ..... اس میں انہوں نے بیعت کی بظاہر تین لیکن حقیقتاً چار اقسام بیان کی ہیں' ایک خاص مواقع پر خاص کاموں کے لئے کی جانے والی بیعت۔ (۲) ..... بیعتِ ارشاد و سلوک اور (۳) ..... بیعتِ نظم و جماعت' اس آخری بیعت کے ضمن میں دو بار مولانا نے "امیر یا امام" کے الفاظ التزاماً استعمال کئے ہیں جن سے (جیسا کہ بعض دیگر شواہد سے ثابت ہو گا جن کا ذکر بعد میں آئے گا) اس کی دو قسمیں بنتی ہیں یعنی ایک یہ کہ اگر صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو اُس کے سربراہ سے بیعت اور دوسری اس صورت میں کہ صحیح اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو اُس کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر سے بیعت!۔

(۲) ..... اس کے بعد مولانا نے دوسری قسم کی بیعت یعنی بیعتِ ارشاد و سلوک کے بارے میں یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ وہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے..... اور پھر اس میں دور حاضر میں جو خرابیاں در آئی ہیں اُن پر شدید تنقید بھی کی ہے..... مجھے اس وقت اس سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہے کہ مولانا کی یہ آراء کس حد تک صحیح ہیں اور کس حد تک غلط..... یا کس حد تک واقعیت پسندی پر مبنی ہیں اور کس حد تک انتہا پسندی کی مظہر!..... اس لئے کہ میری ساری گفتگو مولانا کی بیان کردہ تیسری قسم کی بیعت سے ہے، جسے میں نے مزید دو اقسام میں منقسم قرار دیا ہے۔

(۳) ..... اب آیئے مولانا مرحوم کے ۲۸ر جون ۱۹۴۲ء کے خط کی جانب تو اس میں اوّلاً مولانا نے پیری مریدی والی بیعت پر دوبارہ اُسی انداز کی بھرپور تنقید کی ہے..... اور ثانیاً اُس میں بعض اصلاحات تجویز کی ہیں لیکن اُن کے ضمن میں جو مثالیں دی ہیں وہ کل کی کل خلافت راشدہ سے متعلق ہیں۔ گویا حکومت والی بیعت کا ذکر تو موجود ہے لیکن جماعت والی بیعت کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا..... ثالثاً ..... خلفائے راشدین کی بیعت کے ضمن میں بھی اس حقیقت اور واقعے سے صرفِ نظر کرنا مناسب سمجھا ہے کہ وہاں ہر بار نئے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوتی تھی اور سابق خلیفہ کی بیعت از خود نئے خلیفہ کو منتقل نہیں ہو جاتی تھی۔ رابعاً..... اس ضمن میں ہاتھ میں ہاتھ نہ لینے کے سلسلے میں خواتین کی بیعت کا ذکر کیا ہے لیکن مصافحہ کی حد تک جائے بغیر دونوں طرف سے ہاتھ بڑھانے..... یا ایک برتن میں پانی ڈال کر اُس میں ایک جانب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے دستِ مبارک کو ڈالنا اور دوسری جانب بیعت کرنے والی خاتون یا خواتین کے ہاتھ ڈالنے کا تذکرہ تک نہیں کیا..... (حالانکہ تفہیم القرآن جلد پنجم میں سورۃ الممتحنہ کے ذیل میں یہ ساری باتیں بیان ہوئی ہیں!)

(۴) ..... ان دونوں خطوط کے مابین جو فرق و تفاوت ہے اس کی حقیقت تک رسائی کے لئے اس واقعہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس عرصے کے دوران میں جماعت اسلامی بالفعل قائم ہو چکی تھی اور مولانا مودودی اس کے امیر قرار پا چکے تھے..... لیکن اُس کی روداد یا دستور میں 'بیعت' کی کسی قسم کا ذکر..... یا اُس کی کسی اصلاح یافتہ شکل کا حوالہ تو درکنار سرے سے 'بیعت' کا لفظ ہی کہیں استعمال نہیں ہوا..... سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟..... راقم کا موقف یہ ہے کہ ایسا اس لئے ہوا کہ کسی سبب سے مولانا قیامِ جماعت کے وقت نظمِ جماعت کے ضمن میں اپنے اصل ذہن اور فکر کو بروئے کار نہیں لا سکے!..... چنانچہ ان

کی یہی ذہنی الجھن اس خلط مبحث کا سبب بنی ہے جو جون ۴۲ء والے خط میں نظر آرہا ہے!۔

(۵) ..... رہا یہ سوال کہ وہ سبب کیا تھا جس کے باعث مولانا مرحوم اپنے اصل ذہن و فکر کو بروئے کار نہیں لا سکے تو اس کا جواب اس حقیقت کے حوالے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ مولانا ہمیشہ اس کے قائل رہے کہ جماعت اسلامی کے امیر کو ویٹو کا اختیار حاصل ہونا چاہئے۔ چنانچہ ۴۶ء کے اجتماع الٰہ آباد کے موقع پر اس مسئلے پر شدید بحث ہوئی اور اس مسئلے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی مخالفت کے باعث اس درجہ تلخی پیدا ہو گئی کہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ یہ اکٹھ قائم نہیں رہے گا اور جماعت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ بعض حضرات پر (بشمول مولانا مسعود عالم ندویؒ) گریہ بھی طاری ہو گیا تھا..... بہرحال اُس وقت مولانا نے مصلحت اس میں سمجھی کہ جماعت کے ٹوٹنے کے خطرے کو مول نہ لیا جائے اور کوئی صورت مصالحت کی نکال لی جائے۔ اس لئے کہ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا علی میاں سمیت بہت سے علماء تو جماعت سے پہلے ہی علیحدہ ہو چکے تھے اب مولانا اصلاحی اور بعض دوسرے علماء کی علیحدگی سے جماعت کی دینی حیثیت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا..... چنانچہ ایک نہایت پیچ در پیچ فارمولا وضع کیا گیا۔ جس کی حیثیت خالص نظری رہی۔ اس طرح وہ بحران تو ٹل گیا لیکن چونکہ اس طرح انسان کا ذہن اور مزاج تو نہیں بدل سکتا لہٰذا مولانا کا طرز عمل مسلسل یہ رہا کہ وہ جب بھی کوئی نیا قدم اٹھانا چاہتے تھے اپنی صوابدید کے مطابق اُس کا آغاز کسی جلسۂ عام سے کر دیتے تھے اور بعد میں مجلس شوریٰ اس مخمصے میں گرفتار ہو کر رہ جاتی تھی کہ اب امیر جماعت کے اقدام سے براءت کیسے کرے!..... تا آنکہ ۵۷۔۵۶ء کا بحران آیا اور اُس موقع پر مولانا نے ماچھی گوٹھ میں منعقدہ اجتماع ارکان میں فرمایا کہ میری راہ کی بعض مشکلات ایسی ہیں جن کی بنا پر میں امارت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر انہیں دور کر دیا جائے تو البتہ میں یہ ذمہ داری سنبھال سکتا ہوں۔ اور وہ وجوہات ایسی ہیں کہ میں انہیں تمام ارکان کے سامنے نہیں رکھنا چاہتا لہٰذا ہر حلقے سے دو دو افراد کا انتخاب عمل میں لایا جائے تاکہ میں اُن کے سامنے اپنی مشکل بیان کر سکوں..... اُس اجتماعِ نمائندگان کے سامنے مولانا نے اس دستوری پیچیدگی کو بیان کیا اور دستورِ جماعت میں ترامیم کرالیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی اُن منتخب حضرات میں شامل نہیں تھے البتہ مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب ہو گئے تھے چنانچہ ان کے سامنے یہ معاملہ پہلی بار کوٹ شیر سنگھ میں منعقدہ اجتماعِ مجلسِ شوریٰ میں آیا۔ چنانچہ وہ اسی وقت اٹھ کر روانہ ہو گئے اور لاہور پہنچ کر انہوں نے جماعت کی رکنیت سے استعفاء دے دیا..... اور بعد میں جو تلخ خط و کتابت مولانا مرحوم اور مولانا

اصلاحی کے مابین ہوئی اُس میں انہوں نے یہ الفاظ بھی لکھے کہ مَیں تو سمجھتا تھا کہ میں بلّی کو مار چکا ہوں مجھے کیا معلوم تھا کہ اُسے آپ نے تھیلے میں چھپالیا تھا..... اور اب اپنے "خلوتیانِ راز" کے سامنے اُسے تھیلے سے نکال باہر کیا ہے!..... کوٹ شیر سنگھ کے اجتماع میں مولانا مودودی مرحوم نے جو تقریر کی تھی اُس کا لبِّ لباب یہ تھا کہ جمہوریت یا شورائیت کے تقاضے حکومت اور ریاست کی سطح پر کچھ اور ہوتے ہیں اور تحریک اور جماعت کی سطح پر کچھ اور! مولانا کے ۱۹۵۰ء کے اِن الفاظ کا تعلق مارچ ۱۹۴۱ء کے خط میں مستعمل الفاظ "امیر یا امام" سے جڑتا ہے..... اور یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے..... کہ مولانا کا ذہن اصلاً یہ تھا کہ جماعت اسلامی کے امیر کے پاس ویٹو کا حق ہونا چاہئے..... اور اس کے ساتھیوں کو اُس سے "سمع و طاعت فی المعروف" کے تعلق میں منسلک ہونا چاہئے..... اور مشورہ و مشاورت کو اصلاً ساتھیوں کا 'حق' نہیں بلکہ امیر کی ضرورت اور ساتھیوں کا 'فرض' قرار دینا چاہئے..... البتہ معروف کے دائرے کے اندر اندر کسی بھی مشورے کو قبول یا ردّ کر دینے کا اختیار 'امیر' کے پاس ہونا چاہئے.....

میں اس موقف کو نہ صرف کتاب و سنّت کے نصوص اور امّت کے مسلسل تعامل بلکہ اقامتِ دین کی انقلابی جدوجہد کے تنظیمی تقاضوں کی مصلحتوں کے اعتبار سے بھی صد فی صد درست سمجھتا ہوں..... اور اس کا اعلان بھی میں نے تحریری صورت میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کے موقع پر جولائی ۱۹۷۲ء میں کر دیا تھا..... دس سال بعد ۸۲ء میں جب مولانا کا مارچ ۱۹۴۱ء والا خط پڑھنے میں آیا تو اُس سے راقم کو یقین ہو گیا کہ مولانا مرحوم کا ذہن بھی یہی تھا جسے وہ اپنے بعض با اثر ساتھیوں کی مخالفت کی بنا پر پورے طور پر بروئے کار نہ لا سکے۔ بہرحال کسی کو اس اندازِ فکر سے اتفاق ہو یا اختلاف..... ہمارا اخلاقی فرض یہ ہے کہ حقائق و واقعات کو اُن کے اصل تناظر میں رکھ کر اُن کا حتی الامکان معروضی مطالعہ کریں..... اور کسی کو بھلا لگے یا برا، جو حقائق بھی سامنے آئیں اُن کے علی الاعلان اظہار سے دریغ نہ کریں.....

فقط والسلام،

لاہور..... ۲ر مارچ ۸۶ء

خاکسار..... اسرار احمد عفی عنہ

(نوٹ: افسوس کہ تکبیر نے راقم کی یہ وضاحت پوری شائع نہیں کی۔ بلکہ اس کا صرف خلاصہ شائع کیا۔)

مولانا محمد منظور نعمانی

قربِ الٰہی کے دو راستے[1]

اہل ایمان کے لئے تقرب الی اللہ اور دینی و روحانی ترقی کے دو طریقے اور دو راستے ہیں جو ہمیشہ سے کھلے ہوئے ہیں اور بندگانِ خدا ہر زمانہ میں کم و بیش ان ہی پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچتے رہے ہیں۔

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنی ہی اصلاح و ترقی اور اپنے ہی نفس کے تزکیہ و تحلیہ میں زیادہ سے زیادہ ساعی رہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ فرائض و واجبات کی ادائیگی اور معصیات و مکروہات سے اپنے نفس کی حفاظت کا بیش از بیش اہتمام کرتے ہوئے جس قدر بھی ممکن ہو نفلی عبادات و قربات روزہ و نماز اور ذکر و فکر وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہے۔ بعض ائمہ محققین کی اصطلاح کے مطابق اس طریقہ کو "قرب بالنوافل" کہا جاسکتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فرائض و واجبات کی ادائیگی اور معصیات و مکروہات سے پرہیزگاری کا اہتمام کرتے ہوئے اور اوقات میں گنجائش کے مطابق نفلی عبادات و قربات اور ذکر و فکر میں بھی خاص اشغال رکھتے ہوئے اپنا زیادہ وقت اخلاص نیت کے ساتھ (یعنی محض رضاء الٰہی اور اجر اخروی کو مطمح نظر بنا کر) دوسرے بندگانِ خدا کی اصلاح و ہدایت، تعلیم و تربیت اور تبلیغ و نصیحت جیسے کاموں میں اور اعلاء کلمۃ الحق و احیاء شریعت کی کوششوں میں صرف کیا جائے۔

اس طریقہ کو "قرب بالفرائض" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور اگرچہ اسلام کے قرونِ اولیٰ میں سالکینِ راہ رضا اور طالبین قرب مولیٰ کیلئے یہی عام شاہراہ تھی۔ لیکن بعد کے زمانوں میں کچھ خاص اسباب کی وجہ سے اس راہ پر چلنے والوں کی کثرت نہیں رہی بلکہ معاملہ معکوس ہو گیا۔ یعنی اہل سلوک کے مختلف حلقوں میں زیادہ تر پہلے ہی طریقہ کو اختیار کیا گیا اور اس سے بھی بڑا اور افسوسناک ذہنی تغیر یہ ہوا کہ بہت سے خانقاہی دائروں میں سلوک الی اللہ اور تقرب خداوندی کو صرف اسی پہلے طریقہ (قرب بالنوافل) ہی میں منحصر بھی سمجھا جانے لگا۔ اور

---

[1] اس مضمون کے سلسلے میں ایک اہم نوٹ مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں

ان لوگوں کے خیال میں روحانی و دینی کمال صرف قرب بالنوافل ہی کا نام رہ گیا۔

مختلف زمانوں میں مصلحین و مجددین نے اس غلط خیالی کو محسوس کر کے اس کی اصلاح کی کوششیں بھی کیں لیکن پھر بھی بہت سے خاص و عام حلقوں میں یہ غلط فہمی اب تک چلی آ رہی ہے..... [1] جس کا افسوس ناک اور نہایت مضرت رساں نتیجہ یہ ہے کہ امت کی عمومی تعلیم و تربیت، اصلاح و دعوت اور اقامت دین و احیاء شریعت کا وہ اہم بنیادی کام جو دینی نظام کے لئے گویا ریڑھ کی ہڈی ہے اور دین کی سرسبزی و شادابی جس پر موقوف ہے اور بلاشبہ جس کا اجر اور درجہ بھی اللہ کے نزدیک صرف نفلی عبادات و قربات اور ذکر و فکر میں مشغول رہنے سے بہت زیادہ ہے۔ آج ان عام و خاص حلقوں میں وہ ایک عمومی قسم کا اور معمولی درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے اور دینی و روحانی ترقی کے طالب اور قرب خداوندی کے جویا اپنے اس سفر میں اور اس مقصد کے لئے اس راہ سے چلنے اور اپنے اوقات اور اپنی ہمتوں کو اس رخ پر لگانے کا ارادہ بھی نہیں کرتے جس کی وجہ سے یہ میدان اصحاب ہمت و عزیمت سے خالی اور یہ بازار سرد پڑا ہوا ہے حالانکہ "شہسواروں" کی تگ و تاز کیلئے اصل جولانگاہ اور "شاہ بازوں" کی پرواز کے لئے اصل فضا یہی تھی۔

یہ کیوں ہے؟ اور یہ عام و خاص حلقے اس غلط فہمی اور غلط عملی میں کیوں مبتلا ہوئے اور کیوں اب تک مبتلا ہیں؟ اگرچہ یہ سوال اور اس کا جواب آج کے ہمارے موضوع سے خارج ہے تاہم اصل مدعا ہی کو سلجھانے کی خاطر اس بارہ میں اتنا عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک عوام الناس کی غلط فہمی کا تعلق ہے سو اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ پہلے طریقہ (قرب بالنوافل) میں چونکہ سالک عوام کی دنیا سے الگ تھلگ رہ کر ہمہ تن عبادت اور ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے اور مشاغل دنیوی میں پھنسے ہوئے عوام اس طرز زندگی کو بے حد مشکل اور انتہائی درجہ کا غیر معمولی کام سمجھتے ہیں اور اس طرح کی مشکل اور غیر معمولی باتوں ہی سے متاثر ہونا اور ان کی خاص اہمیت و وقعت سمجھنا چونکہ عام انسانوں کا مزاج ہے اس لئے یہ بے چارے اسی طریق کو

---

[1] گزشتہ صدیوں میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اور ان کے بعد ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے امیر المومنین سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء نے اس غلطی کی اصلاح کی طرف خاص اور مستقل توجہ فرمائی جیسا کہ "مکتوبات امام ربانی" اور "صراط مستقیم" کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔

قربِ الٰہی اور خدارسی کا خاص الخاص راستہ سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس طریق پر چلنے والوں سے خوارق و کشوف وغیرہ کا ظہور بھی نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے بھی خیال عام اسی طریق کو خدارسی کا خاص راستہ اور اسی طرزِ زندگی کو سب سے بڑا دینی و روحانی کمال سمجھتا ہے۔

رہے اس خیال کے خواص یعنی خود اہلِ سلوک کے وہ حلقے جو اس غلطی میں مبتلا ہیں اور سلوک الی اللہ کو اسی طریق میں منحصر سمجھتے ہیں۔ سو اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ جن میں سے ایک عمومی اور اس جگہ قابلِ ذکر وجہ یہ بھی ہے کہ اس طریق (قرب بالنّوافل) میں یکسوئی کے ساتھ کثرتِ ذکر و فکر سے سالک کے باطن میں ایک گونہ لطافت و نورانیت اور ملاءِ اعلیٰ سے ایک طرح کی خاص مناسبت و موانست پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنے اندر کچھ آثار و انوار محسوس کرنے لگتا ہے اور بسا اوقات خاص "احوال و کیفیات" اور "مشاہدات و تجلیات" کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے۔ اور دوسرے طریقہ (قرب بالفرائض) میں چونکہ عوام کے ساتھ بھی اختلاط رہتا ہے اور احوال و کیفیات کا ورود اس میں اس طرح سے عموماً نہیں ہوتا۔ یا بہت کم ہوتا ہے بہرحال پہلے ہی طریقہ کے ساتھ بہت سے اہلِ سلوک کی خصوصی دلچسپی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے۔

حالانکہ یہ "احوال و کیفیات" اور "مشاہدات و تجلیات" اس فن کے اکابر و ائمہ کے نزدیک کوئی خاص مقصدی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان کا درجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ذریعہ مبتدیانِ راہِ سلوک کی ہمت افزائی کی جاتی ہے تاکہ شوق و طلب برابر ترقی پذیر رہے اور سعی و جہد کا قدم آگے بڑھتا رہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مشہور خلیفہ ملا یار محمد بدخشی کو ایک مکتوب میں انہی "مشاہدات و تجلیات" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

شیخ اجلّ امامِ ربّانی حضرت خواجہ یوسف ہمدانی فرمودہ اند تلک خیالات تربّی بہا اطفال الطریقہ

"شیخ اجل امامِ ربانی حضرت خواجہ یوسف ہمدانی نے فرمایا ہے کہ یہ خیالی چیزیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ مکتبِ طریقت کے بچوں کی تربیت کی جاتی ہے۔"

اور ایک دوسرے مکتوب میں جو ملا حاجی محمد لاہوری کے نام ہے ارقام فرماتے ہیں:

احوال و مواجید و علوم و معارف کہ صوفیہ را در اثنائے راہ دست میدہند نہ از مقاصد

اندبل اوھام وخیالات تر بّٰی بہا اطفال الطریقۃ[1]

(مکتوب نمبر ۳۶)

"جو احوال و مواجید اور علوم و معارف صوفیہ پر اثناء سلوک میں وارد ہوتے ہیں وہ مقاصد میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ اوھام و خیالات کے قبیل کی چیزیں ہیں جن کے ذریعہ مکتب طریقت کے بچوں کو تربیت دی جاتی ہے۔"

بہرحال یہ انوار و تجلیات اور یہ احوال و کیفیات جن کا ورود "قرب بالنوافل" کے راستہ سے چلنے والے بہت سے سالکوں پر ہوتا ہے اگرچہ وسیلۂ تربیت اور ذریعۂ ترقی ہونے کی حیثیت سے قابلِ شکر انعاماتِ الٰہیہ ہیں، تاہم نہ یہ خود مقصود و مطلوب ہیں اور نہ ایسی دولت ہے جس کے لئے "قرب بالفرائض" کا راستہ چھوڑ کر "قرب بالنوافل" ہی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

حضرت امام ربانیؒ ایک مکتوب میں خاص اپنے متعلق ارقام فرماتے ہیں۔

"ایں فقیر از نقد وقت خود می نو یسد کہ مدتہا از علوم و معارف و از احوال و مقامات در رنگ ابر نیساں ریختند و کارے کہ باید کرد بعنایت اللہ سبحانہ، کردند۔ والحال آرزوئے نہ ماندہ است الا آں کہ احیائے سنت از سننِ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰات و التسلیمات نمودہ آید و احوال و مواجید ارباب ذوق را مسلم باشد"

(مکتوب ۳۷ جلد ۱)

"یہ فقیر خود اپنی حالت لکھتا ہے کہ مدتوں علوم و معارف اور احوال و مقامات ابرِ نیساں کی طرح برسے اور ان کا جو نتیجہ نکلنا چاہئے تھا اللہ تعالیٰ کی عنایت سے وہ

---

[1] حضرت مجددؒ کی ان عبارات کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ "احوال و کیفیات" اور "مشاہدات و تجلیات" شیطانی قسم کے وساوس و اوہام ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے (جیسا کہ خود حضرت مجدد ہی نے اسی مکتوب میں آگے چل کر وضاحت فرمائی ہے) یہ بھی ایک درجہ میں انعامات الٰہیہ ہیں اور سالک کو ان سے بہت کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ان سے ہمت افزائی ہی کا کام لیا جائے۔ اور سالک انہی کو مقصود و منتہا سمجھ کر ان میں پھنس کر نہ رہ جائے۔

پورا ہوا اور اب اس کے سوا کوئی ارمان اور آرزو نہیں رہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے کسی سنت کا احیاء کیا جائے اور اس کو رواج دیا جائے اور احوال و مواجید اربابِ ذوق کو مبارک ہوں۔"

قرب بالفرائض کی ترجیح و فضیلت کے وجوہ..... "قرب بالفرائض" کے طریقہ اور اس سلسلہ کے مشاغل (مثلاً خدا فراموش انسانوں میں تبلیغ و دعوت، جاہلوں ناواقفوں کی تعلیم و تربیت اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کے لئے جدّوجہد وغیرہ) کو "قرب بالنوافل" کے طریقہ کے مقابلہ میں ترجیح و فضیلت کی یہ وجہ تو بالکل ظاہر ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے خاص مشاغل و وظائف ہیں۔ اور حضرات انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) خاص انہی کاموں کے لئے مبعوث ہوتے ہیں۔ پس اپنی قوتوں اور اپنی ہمتوں کو انہی کے طریقے پر اخلاص و احتساب کے ساتھ ان کاموں میں لگانا، اور اسی جدّوجہد کو اپنا خاص وظیفۂ حیات بنالینا ان مقدّس و برگزیدہ ہستیوں کی خاص نیابت بلکہ ایک طرح سے ان کی رفاقت اور ان کے مقصد، ان کی فکر اور ان کے درد میں شرکت ہے اور ایک غیر نبی کے لئے اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں اس طریقہ کا فیض متعدّی ہے کہ اس راہ کا چلنے والا اپنی اصلاح و تکمیل کے ساتھ ساتھ اور سینکڑوں ہزاروں بندگانِ خدا کی اصلاح و ہدایت کا بھی ذریعہ بنتا ہے اور اس واسطے صحیح حدیث.....

من دلّ علی خیر فله مثل اجر فاعله۔ (مسلم)

"جو شخص کسی آدمی کو کسی نیکی کی طرف راہ نمائی کرے تو اس شخص کو اس نیکی کے کرنے والے ہی کے برابر الگ ثواب ملے گا۔"

کے مطابق سینکڑوں ہزاروں انسانوں کے بے حساب و بے شمار اعمالِ خیر کے بھی اجر کا مستحق ہوتا ہے۔

نیز یہاں یہ بھی نکتہ خاص طور سے ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ "قرب بالنوافل" کے طریق میں زیادہ سے زیادہ محنت و مجاہدہ کرنے والے اپنے گنے چنے فرائض کے علاوہ صرف اپنی نفلی عبادات و قربات ہی کا سرمایہ جمع کر سکتے ہیں۔ لیکن "قرب بالفرائض" کی راہ پر چلنے والے چونکہ سینکڑوں انسانوں کو ان کے بنیادی فرائض کی تبلیغ و تلقین کرتے اور تعلیم دیتے ہیں اس

لئے ان کے حساب میں اپنے ذاتی فرائض و نوافل کے علاوہ ان سینکڑوں آدمیوں کے فرائض (اور نوافل) کا بھی اجر لکھا جاتا ہے۔ اور یہ معلوم و مسلّم حقیقت ہے کہ فرائض کا اجر نوافل سے بدرجہا زیادہ ہے اور نفسِ ایمان و اسلام کا درجہ تو یقیناً فرائض و نوافل سب سے زیادہ ہے۔ پس اللہ کا جو بندہ "قرب بالفرائض" کی راہ اختیار کر کے خدا اور رسولؐ سے بیگانہ اور حقیقتِ ایمان و اسلام سے ناآشنا قسم کے جاہلوں اور غافلوں میں تبلیغ کر کے اور ان کو تعلیم و تربیت دے کے دین سے آشنا کرتا ہے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں ان لوگوں کے نفس ایمان و اسلام کا اجر بھی لکھا جاتا ہے۔ بے شک اللہ کے سوا کوئی نہیں، جو اس اجر بے حساب کا حساب بھی لگا سکے۔

نیز "قرب بالنوافل" کے طریق میں صرف اپنی زندگی تک ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے، جہاں موت نے روح کو جسم سے لگ کیا اور سلسلۂ عمل ختم ہوا۔ ترقی بھی ختم ہو جاتی ہے مگر "قرب بالفرائض" کی راہ میں جب تک اس کے دینی و علمی فیض کا سلسلہ جاری رہے (خواہ وہ واسطہ در واسطہ کی شکل میں قیامت تک ہی جاری رہے) برابر اعمال نامہ میں اندراج ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے درجات میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح وارد ہوئی ہے۔

اور قطع نظر ان تفصیلات سے، سب سے اہم بات وہی ہے جو پہلے عرض کی گئی ہے کہ "قرب بالفرائض" کا یہ راستہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے خواص اصحاب و حواریّین کا راستہ ہے۔ اور اس کے مشاغل (تعلیم و تعلّم، دعوت و تبلیغ، اصلاح و ارشاد، اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کی کوشش وغیرہ) ان حضرات کے خاص مشاغل ہیں۔ پس اس طریق کو اختیار کرنے والے اور ان کاموں کو سنبھالنے والے بلاشبہ تمام حضرات انبیاء علیہم السلام کے اور خصوصاً حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دینی خلفاء ہیں۔ اگرچہ سیاسی نظام اور سیاسی طاقت والی خلافتِ ظاہرہ ان کے پاس نہیں ہے۔ لیکن اصل امانتِ نبوی کی حفاظت اور تبلیغ و دعوت اور ماننے والوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ارشاد کا کام بھی بلاشبہ ایک طرح کی خلافتِ نبوّت ہی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ مقصدی اہمیت اس کو زیادہ حاصل ہے۔ اور بروجہ احسن اور وسیع پیمانہ پر انہی مقاصد کی تکمیل کے لئے "خلافت ظاہرہ" مقصود ہوتی ہے۔

نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی غیر سیاسی خلافت (حضرت شاہ ولی اللہ کی اصطلاح کے مطابق 'خلافتِ باطنہ') اگر ایک مرکز اور نظام کے ساتھ

ہو تو "خلافتِ ظاہرہ" تک بھی پہنچا دیتی ہے۔ "استخلاف فی الارض" اور "تمکینِ دینی" کا انعام انہی فرائض اور انہی خدمات کی انجام دہی پر مرتّب ہوتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور یہی اس کی سنّتِ ازلیہ ہے بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ "خلافتِ نبوت" کے قیام کا صحیح راستہ صرف یہی ہے اور اس طریقہ اور اس ترتیب کو چھوڑ کر دوسرے طریقوں پر جدّوجہد کرنے سے اگرچہ "اپنی حکومت قائم کی جا سکتی ہے لیکن خلافتِ نبوت قائم نہیں ہو سکتی۔ والتفصیل لا یسعه المقام

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ عرض کرنا یہی تھا کہ "قرب بالفرائض" کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے اور اس کے مشاغل 'تبلیغ و دعوت 'تعلیم و تربیت' اصلاح وارشاد اور اقامتِ دین واحیاءِ شریعت کے لئے جدّوجہد وغیرہ کا درجہ اور اجر نفلی عبادات وقربات اور ذکر وفکر ہی میں مشغول و منہمک رہنے سے یقیناً بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً اس دور میں تو اس طریقہ اور ان مشاغل کی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ یہ زمانہ ہی عوامی تحریکات اور عمومی و جمہوری دعوتوں کا ہے اور مختلف مادی اور لادینی تحریکیں بے حد تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی عوام کو اپنی طرف جذب کرتی جا رہی ہیں۔ ایسے وقت میں بھی اگر دین کی دعوت ' دینی تعلیم و تربیت اور اصلاح وارشاد کی جدوجہد وسیع پیمانے پر اور عوامی تحریک کے رنگ میں نہیں کی گئی اور اللہ کے وفادار اور اس کی رضا کے طلب گار بندے خدمتِ دین کے اس عمومی میدان میں نہ اترے تو دین کی امانت کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

امام ابو اسحاق اسفرائینی کا پرجوش اور ولولہ انگیز پیغام رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ ان کے زمانے میں جب عام مسلمانوں کا دین و ایمان بعض خاص گمراہانہ فتنوں کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گیا تو آپ اپنے عہد کے بعض ان اکابر و مشائخ کے پاس پہنچے جو دنیا و مافیہا سے یکسو ہو کر پہاڑوں کے غاروں میں عبادت و مجاہدہ میں مصروف تھے اور کہا (اللہ اکبر کیسے درد سے کہا)......

ا كلة الحشيش انتم هٰهنا و امّة محمد صلّى اللّٰه عليه وسلّم فى الفتن۔

"جنگل کی سوکھی گھاس پر گزارہ کرنے والو! تم یہاں ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی امت گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہے۔"

الغرض یہ کام یعنی مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت اور جاہلوں ناواقفوں کی دینی تعلیم و تربیت اور غافلوں، ناآشناؤں کو تبلیغ و دعوت کا کام اگرچہ ہر وقت اور ہر حال میں بہت بڑا اور بہت اہم کام ہے اور جیسا کہ تفصیل سے اوپر عرض کیا گیا۔ عند اللہ اس کا درجہ بہت اعلیٰ و ارفع ہے اور امتیوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کمال اور ترقی کا کوئی مقام نہیں ہے۔ بقول حضرت مجددؒ۔

"ہیچ کمالے بر تبہ دعوت و تبلیغ نہ رسد۔

فان احب عباد الله الى الله من حبب الله الى عباده و حبب عباد الله الى الله و هو الداعى و المبلغ "

(مکتوبات امام ربانی مکتوب ۵۷، ج ۲)

"کوئی کمال دعوت و تبلیغ کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اللہ کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کو اس کے بندوں کا محبوب بنادے اور بندوں کو اللہ کا محبوب بنادے۔ اور وہ داعی اور مبلغ ہوتا ہے۔"

لیکن بالخصوص ایسے زمانے میں کہ چاروں طرف سے مادیت اور لادینیت کے بادل امنڈ رہے ہوں اور دین سے غفلت و جہالت اور خدا فراموشی کی گھٹائیں نہایت تیزی سے دنیا پر چھائے چلی جارہی ہیں۔ سو ایسے وقت میں تو ان کاموں کی قدر و قیمت اللہ کے یہاں بے حساب بڑھ جاتی ہے۔ حضرت مجددؒ ہی نے کیسی اچھی تمثیل میں فرمایا ہے۔

"مثلاً سپاہیان در وقت غلبہ دشمناں و استیلاء مخالفاں اگر اندک تردد می کنند آں قدر نمایاں میشود و اعتبار مے گردد کہ در وقت امن اضعاف آں در خیز اعتبار نمی آید۔"

(مکتوب نمبر ۴۴)

"مثلاً جو سپاہی دشمن کے غلبہ اور مخالفین کے چڑھ آنے کے نازک وقت میں تھوڑی سی بھی وفادارانہ جدوجہد کرتے ہیں وہ ایسا اعتماد اور امتیاز حاصل کر لیتے ہیں کہ عام امن و سکون کے وقت کئی گنا جانفشانی بھی کریں تو وہ اعتماد و اعتبار پیدا نہیں ہوتا۔"

الحاصل ہر زمانہ میں خاص کر ہمارے اس دور میں دینی و روحانی ترقی اور قرب الٰہی و رضائے خداوندی کا سب سے بڑا ذریعہ اور شاہراہ "قرب بالفرائض" ہی کا طریقہ ہے اور اس کے مشاغل مثلاً دعوت و تبلیغ، اصلاح و تعلیم اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کے لئے جدوجہد کا درجہ اور اجر یکسوئی کے ساتھ نفلی عبادات اور ذکر و مراقبہ ہی میں منہمک و مشغول رہنے سے

بہت زیادہ ہے۔ لیکن "قرب بالفرائض" کی ان مشاغل کی یہ امتیازی حیثیت اور "قرب بالنوافل" کے مقابلہ میں ان کی یہ عظمت اور فوقیت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کاموں میں اشتغال اخلاص واحتساب اور خشیت وانابت کی صفت کے ساتھ ہو اگر یہ نہیں ہے تو پھر ساری دوڑ دھوپ اور جدّوجہد ایک بے روح عامیانہ تحریک یا ایک پیشہ اور حرفہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (اعاذنا اللہ من ذٰلک) اور ان اوصاف (اخلاص واحتساب) کے حاصل ہونے کا عام آزمودہ اور عادتی ذریعہ ان اوصاف والوں کی صحبت ورفاقت اور تنہائیوں کے اوقات میں ذکر وفکر کی کثرت ہے۔ ان دونوں چیزوں کے اہتمام کے بغیر اخلاص واحسان جیسی کیفیات کا پیدا ہونا اگرچہ عقلاً ناممکن نہیں لیکن عادتاً دشوار اور اہلِ تجربہ کی شہادت کے مطابق شاذ ضرور ہے۔

ضروری استدراک..... اوپر کی سطروں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ "قرب بالنوافل" کے طریقہ کو ہم غلط یا غیر شرعی یا غیر فرضی سمجھتے ہیں، ہرگز نہیں! حاشا، ہزار بار حاشا۔ ہماری گزارش کا مدّعا تو صرف یہ ہے کہ "قرب بالفرائض" کا راستہ قابلِ ترجیح اور افضل ہے اور خصوصاً ہمارے اس زمانہ کے حالات اور دینی ضروریات کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے بندے اس طریق کو اختیار کریں اور اپنی ہمتوں کو اسی رخ پر لگائیں۔

نیز ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ فی زمانہ ماحول کے عمومی فساد کی وجہ سے اکثر طبیعتوں کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ کچھ مدّت یک سوئی کے ساتھ ذکر وفکر کے بغیر ان پر اخلاص واحسان کا رنگ بھی نہیں چڑھتا سو ایسے حضرات کے لئے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ تیاری کے طور پر کچھ دنوں اسی طریق پر چلیں لیکن مطمحِ نظر دین کی خدمت ونصرت ہی کے مشاغل کو بنائیں۔ اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کا اس سے بہتر مصرف اور کوئی نہیں۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عوامی دعوت وتبلیغ اور عوامی تعلیم وتربیت کا یہ کام جس کی طرف اس مضمون میں میں نے خصوصیت کے ساتھ دعوت دی ہے۔ اس سے ہماری مراد خاص متعارف وعظ گوئی نہیں ہے جس کے لئے علمِ دین کی ایک خاصی مقدار ضروری ہے۔ بلکہ حقیقتِ دین سے ناآشنا طبقوں میں دین کا صحیح شعور پیدا کرنا اور کم از کم دین کی بنیادی باتوں کی ان کو تعلیم وتلقین کرنا اور اس درجہ کی عملی اصلاح کی کوشش کرنا اس سلسلہ کا ابتدائی کام ہے جس میں ہر مسلمان اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ نہ کچھ حصہ لے سکتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ خود بھی تعلیم وتربیت حاصل کر سکتا ہے۔

اب ہم اس مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔

عن الحسن مرسلا سئل رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم عن رجلین کانا فی بنی اسرائیل احدھما کان عالما یصلّی المکتوبۃ ثم یجلس فیعلّم الناس الخیر والاخر یصوم النھار و یقوم اللّیل ایّھما افضل؟

قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم فضل ھذا العالم الذی یصلّی المکتوبۃ ثم یجلس فیعلّم الناس الخیر علی العابد الذی یصوم النھار و یقوم اللّیل کفضلی علی ادنا کم

رواہ الدارمی (مشکوۃ)

"حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے بنی اسرائیل کے دو شخصوں کی بابت سوال کیا جن میں سے ایک دین کا جاننے والا تھا اس کا طریقہ یہ تھا کہ فرض نماز پڑھتا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو اچھی باتیں بتاتا اور سکھاتا اور دوسرا ہمیشہ دن کو روزے رکھتا اور رات بھر نوافل پڑھتا (حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص جو فرائض ادا کرتا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو اچھی باتیں بتاتا اور سکھاتا تھا۔ اس قائم اللّیل صائم النّہار عابد کے مقابلہ میں ایسی فضیلت رکھتا ہے جیسی کہ تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت حاصل ہے۔"

ملحوظ رہے کہ حضورؐ کے جواب میں جو تمثیل ہے یہ مقدارِ فضیلت میں نہیں ہے بلکہ فضیلت کی نوعیت میں تمثیل و تشبیہ ہے۔

نوٹ

عجیب حسن اتفاق ہے کہ مذکورہ بالا موضوع ہی پر امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے یکم مئی ۸۱ء کو تنظیم اسلامی کے چھٹے سالانہ اجتماع کے موقع پر ایک مفصل خطاب ارشاد فرمایا تھا جسے بعد ازاں "قربِ الٰہی کے دو مراتب تقرّب بالفرائض اور تقرّب بالنوافل" کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ قارئین محسوس کریں گے کہ حکمتِ دینی کے اس اہم موضوع پر دونوں بزرگوں کے خیالات میں کامل ہم آہنگی موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خطاب میں اگر دعوتی و تحریکی رنگ غالب تھا تو مولانا منظور نعمانی کا مقالہ ان کے رسوخ فی العلم کا آئینہ دار ہے۔ مولانا نعمانی کا یہ مقالہ ہم بہنامہ "الحق" کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

ایک عظیم دُعا

حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو تہجد پڑھنے کھڑے ہوتے تو یہ دُعا کرتے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْھِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْھِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ مَلِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْھِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُکَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُکَ حَقٌّ وَّقَوْلُکَ حَقٌّ وَّالْجَنَّةُ حَقٌّ وَّالنَّارُ حَقٌّ وَّالنَّبِیُّوْنَ حَقٌّ وَّمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰھُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْکَ اَنَبْتُ وَبِکَ خَاصَمْتُ وَاِلَیْکَ حَاکَمْتُ فَاغْفِرْلِیْ مَاقَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُکَ ——— (رواہ البخاری ومسلم)

(اے میرے اللہ! ساری حمد وستائش تیرے ہی لیے ہے اور تو ہی اس کا مستحق ہے، تو ہی قائم رکھنے والا ہے زمین و آسمان کا اور ان سب چیزوں کا جو ان میں ہیں (یعنی سارے عالم علوی اور سفلی کا وجود تیرے ہی ارادہ سے قائم ہے) مولا! ساری حمد وستائش کا تو ہی مستحق ہے، تو ہی نور ہے زمین و آسمان کا اور ان سب کا جو زمین و آسمان میں ہیں (یعنی سارے عالم میں جہاں بھی نور کی کوئی کرن ہے وہ تیرے ہی نور سے ہے) اور ساری حمد وستائش تیرے ہی لیے ہے، تو فرماں روا ہے زمین و آسمان اور اس ساری کائنات کا جو زمین و آسمان میں ہے، ساری حمد وستائش تیرے ہی لیے سزاوار ہے، تو حق ہے تیرا وعدہ حق ہے، مرنے کے بعد تیرے حضور حاضری اور تیری ملاقات حق ہے، اور تیرا فرمان حق ہے اور جنّت حق ہے اور دوزخ حق ہے اور سارے نبی برحق ہیں اور محمدؐ بھی برحق ہیں اور قیامت کا آنا برحق ہے۔ اے اللہ! میں نے اپنے کو تیرے سپرد کر دیا اور میں تجھ پر ایمان لایا اور میں نے تیرا سہارا پکڑ لیا اور پورا بھروسہ تجھ پر کر لیا اور اپنا رخ تیری طرف کر دیا اور (مخالفین حق سے) تیری ہی مدد سے میری ٹکر ہے، اور میں نے اپنا مقدمہ فیصلے کے لیے تیری ہی بارگاہ میں پیش کر دیا ہے، پس اے میرے اللہ بخش دے میرے وہ سب قصور جو مجھ سے پہلے سرزد ہوئے اور جو پیچھے ہوئے اور جو میں نے پوشیدہ کیے اور جو علانیہ کیے اور جن کے بارے میں تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے، تو جسے چاہے آگے بڑھانے والا ہے اور جسے چاہے پیچھے ڈال دینے والا ہے، تیرے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں، صرف تو ہی معبود برحق ہے۔

عطیہ اشتہار: رفیع میڈیکل سٹورز۔ ۱۔ مزنگ روڈ لاہور

اسلام اور پاکستان کے خلاف کام کرنے والے قادیانی گروپ نے ایک بدنام دہشت گرد کی خدمات حاصل کر کے اسے پاکستان بھیج دیا

قادیانیوں کی جانب سے ڈاکٹر اسرار اور مولانا طاہر کے قتل کا منصوبہ

تحقیقاتی اداروں نے دہشت گرد کے نام اور حلیے سے پولیس اور دیگر اداروں کو مطلع کر دیا، ملزم کی جلد گرفتاری کی توقع

بلاتبصرہ

وسط فروری ۸۹ء میں پاکستان کے قومی سطح کے اخبارات میں اختصار کے ساتھ لیکن روزنامہ 'آغاز' کراچی ——— اور روزنامہ 'مرکز' اسلام آباد میں تفصیل کے ساتھ ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ جس کے بارے میں ہفت روزہ 'ندا' کے شمارہ بابت ۲۸ فروری میں مختصر اور شمارہ بابت ۷ مارچ میں تفصیلی رپورٹ شائع ہو چکی ہے ——— چونکہ قارئین 'میثاق' کا حلقہ 'ندا' کے مقابلے میں وسیع تر ہے' لہٰذا دائیں جانب تو روزنامہ 'آغاز' کراچی کی اشاعت بابت ۱۸ فروری ۱۹۸۹ء کی چھ کالمی جلی سرخی کا عکس شائع کیا جا رہا ہے' اور بائیں جانب روزنامہ 'مرکز' اسلام آباد کی اشاعت بابت ۱۸ فروری ۱۹۸۹ء کی خبر کا مکمل متن شائع کیا جا رہا ہے:

مزید برآں ہفت روزہ 'ندا' کی رپورٹ کا آخری حصہ بھی ہدیۂ قارئین ہے ——— وَھُوَ ھٰذا:

دریں اثناء اس جامع منصوبہ کی تیاری کے فوراً بعد پاکستان کی سراغ رساں ایجنسیوں کو اس کا علم ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان کے تمام ہوائی اڈوں پر امیگریشن حکام کو چوکنا کر دیا گیا۔ تاہم ملزم رانا مقبول احمد اپنے مشن کی تکمیل کے لئے گزشتہ روز الصبح پونے تین بجے کینیڈین پاسپورٹ پر کینیڈا سے کراچی پہنچا۔ جہاں سے پون دس بجے صبح جب پی آئی اے کی پرواز نمبر پی کے ۳۰۰ کے ذریعے اسلام آباد پہنچا تو یہاں پر پہلے سے تیار امیگریشن کے عملے نے اسے گرفتار کر کے ایئرپورٹ پولیس کے حوالے کر دیا۔ ابتدائی تفتیش کے بعد

ملزم کو لاہور کلب میں پولیس انٹیلی جنس بیورو اور سپیشل برانچ کے ماہرین پر مشتمل خصوصی ٹیم ملزم کے خلاف تحقیقات کرے گی۔ ادھر علماء دین کے قتل کے لئے بھیجے جانے والے گروہ کے دوسرے ارکان کی گرفتاری کے لئے پولیس اور خفیہ ایجنسیاں حرکت میں آگئی ہیں۔ ملزم رانا مقبول احمد کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اسے اپنا مشن ایک ماہ کے اندر مکمل کر کے واپس کینیڈا جانا تھا۔ اور پاکستان میں قیام کے دوران اس کی بعض اہم شخصیات کے علاوہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے دہشت گرد تنظیم سے آتشیں اسلحہ یا دھماکہ خیز مادہ حاصل کرنا تھا۔ لیکن بروقت یہ راز فاش ہو جانے سے اس گروہ کا مشن پورا نہ ہو سکا اور ملک ایک سنگین بحران کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ ادھر ان ذرائع کا کہنا ہے کہ اس گروہ کی گرفتاری کے بعد علامہ عارف الحسینیؒ کے قاتلوں کا سراغ ملنے میں آسانی ہوگی۔

روزنامہ 'مرکز' اسلام آباد کی چھ کالمی سرخی یہ تھی:

"قادیانی اور یہودی لابی نے ملک کی صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انارکی اور افراتفری پھیلانے کے لیے تربیت یافتہ گروہ پاکستان بھیج دیئے۔"

"دہشت گردی اور قتل و غارت کا منصوبہ ناکام!"

"ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا طاہر القادری اور ممتاز علمائے کرام کو قتل کرنے کی سازش پکڑی گئی، گروہ کا سرغنہ گرفتار!"

اور مفصل خبر کا 'عکس' حسبِ ذیل ہے:

اسلام آباد ۔ (مدثر مدنی رخلیل انجم سے) سراغ رساں ایجنسیوں نے یہودیوں اور قادیانیوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی جانب سے دو علمائے دین ڈاکٹر اسرار احمد اور علامہ طاہر القادری کو قتل کرا کے ملک میں انتشار پھیلانے کی بھیانک سازش کا سراغ لگاتے ہوئے اس مقصد کے لیے پاکستان بھیجے جانے والے ایک پاکستانی نژاد کینیڈین کو اسلام آباد کے ہوائی اڈے سے گرفتار کر لیا جبکہ دہشت گردوں کے اس گروہ کے باقی ارکان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں یہ گروہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ایک سپر پاور سے دہشت گردی کی چھ ماہ کی خصوصی تربیت مکمل کر کے پاکستان آیا ہے ملزم کو ابتدائی تفتیش کے بعد مزید تحقیقات کے لیے لاہور بھیج دیا گیا ہے جہاں خفیہ ایجنسیوں اور پولیس ماہرین پر مشتمل خصوصی ٹیم تحقیقات کرے گی دہشت گرد تنظیم کے یہ ارکان مختلف بہانوں سے پاکستان پہنچ رہے تھے کہ ان کی سازش کا انکشاف ہو گیا ان ذرائع کے مطابق پاکستان کی نامور دینی شخصیات ڈاکٹر اسرار احمد، علامہ طاہر القادری ، مرزائیت کے خلاف تحریک میں پیش پیش تھے اور بین الاقوامی حضرت صلعم کے خلاف قادیانیوں کی ہر سازش کو ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں جس سے قادیانیوں کے مشن کو نقصان پہنچ رہا تھا ان ذرائع کے مطابق قادیانیوں کی بین الاقوامی تنظیم نے ان دونوں علمائے دین اور بعض دوسری دینی شخصیات کو راستے سے ہٹانے کے لیے کینیڈا اور امریکہ میں یہودی لابی سے رابطہ قائم کیا پاکستان کی موجودہ سیاسی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد اور علامہ طاہر القادری کے علاوہ بعض اہم مذہبی شخصیات کو قتل کرا کے ملک میں وسیع پیمانے پر انتشار پھیلانے اور اپنے مخصوص مفادات حاصل کرنے کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا اور شاتم رسولؐ سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف ملک میں پھیلی ہوئی غم و غصے کی لہر کو وسیع تر انتشار میں تبدیل کرنے کے لیے سازش کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ایک دہشت گرد گروہ تشکیل دیا گیا جس کے ارکان نے مختلف مراحل میں ایک سپر طاقت میں چھ چھ ماہ کی خصوصی تربیت حاصل کی رانا مقبول احمد ولد رانا ارشاد احمد کو بنیادی طور پر گروہ کا سرغنہ مقرر کیا گیا اور ان ارکان کو باری باری پاکستان بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا گیا

دیا گیا ملزم رانا مقبول احمد انگوری باغ شالیمار کالونی لاہور کا رہنے والا ہے اور آج کل مستقل طور پر کینیڈا میں مقیم ہے دریں اثناء اس جامع منصوبہ کی تیاری کے فوراً بعد پاکستانی سراغ رساں ایجنسیوں کو اس کا علم ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان کے تمام ہوائی اڈوں پر امیگریشن حکام کو چوکنا کردیا گیا۔ تاہم ملزم رانا مقبول احمد اپنے مشن کی تکمیل کے لئے گذشتہ روز العبح پونے تین بجے کینیڈین پاسپورٹ پر کینیڈا سے کراچی پہنچا جہاں سے وہ پونے دس بجے صبح جب پی آئی اے کی پرواز نمبر پی کے ۳۰۰ کے ذریعے اسلام آباد پہنچا تو یہاں پہلے سے تیار امیگریشن کے عملے نے اسے گرفتار کرکے ائیرپورٹ پولیس کے حوالے کردیا۔ ابتدائی تفتیش کے بعد ملزم کو لاہور بھیج دیا گیا۔ پولیس انٹیلیجنس بیورو اور سپیشل برانچ کے ماہرین پر مشتمل خصوصی ٹیم ملزم کے خلاف تحقیقات کرے گی۔ ادھر علامہ ہی کے قتل کے لئے بھیجے جانے والے گروہ کے دوسرے ارکان کی گرفتاری کے لئے پولیس اور خفیہ ایجنسیاں حرکت میں آگئی ہیں۔ ملزم رانا مقبول احمد کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اسے اپنا مشن ایک ماہ کے اندر مکمل کرکے واپس کینیڈا جانا تھا۔ اور پاکستان میں قیام کے دوران اس کی بعض اہم شخصیات کے علاوہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے دہشت گرد تنظیم سے آتشیں اسلحہ یا دھماکہ خیز مادہ حاصل کرنا تھا۔ لیکن بروقت یہ سازش فاش ہوجانے سے اس گروہ کا مشن پورا نہ ہوسکا اور ملک ایک سنگین بحران کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ ادھر ان ذرائع کا کہنا ہے کہ اس گروہ کی گرفتاری کے بعد علامہ عارف الحسینی کے قاتلوں کا سراغ ملنے میں آسانی ہوگی۔

اہلِ پاکستان کی خدمت میں ایک قلم کار کا ہدیۂ عقیدت
سیّد قاسم محمود کے زیرِ ادارت

انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا

(ردیف وار ترتیب میں)

Encyclopedia Pakistanica

پاکستانیات کے موضوع پر چھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل چالیس ہزار سے زیادہ معلوماتی مضامین پر محیط، نادر تصاویر، خاکے، نقشے، ردیف وار ترتیب میں ماہوار قسطوں میں فوٹو آفسٹ پر انتہائی خوبصورتی سے باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے (فی قسط دس روپے۔ زرسالانہ: سَو روپے) اپنے ہاکر سے کہہ دیجیے کہ وہ ہر ماہ پہلی تاریخ کو "پاکستانی کا انسائیکلوپیڈیا" آپ کے گھر یا دفتر پہنچا دیا کرے یا مندرجہ ذیل پتہ پر لکھیے:

شاہکار بک فاؤنڈیشن

حاجی بلڈنگ حسن علی آفندی روڈ کراچی فون ۲۱۸۵۱۵

اطلاع برائے تبدیلی پتہ

تنظیم اسلامی پشاور نے اپنا دفتر درج ذیل مقام پر منتقل کرلیا ہے

اے۔۷ رحمٰن پلازہ خیبر بازار پشاور
فون: ۲۱۴۷۳۴

یہاں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتب و کیسٹس دستیاب ہیں۔

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیئور®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور
۲۲- لیاقت علی پارک ۴- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان
فون: ۲۲۱۵۹۸-۳۱۲۷۵۴

SV ADVERTISING

صدیوں کی آزمودہ اور چنیدہ نباتات کے نہایت موثر، کافی وشافی
اجزا حاصل کرنا کمالِ فن ہے، دواسازی کی عظمت ہے۔ ہمدرد میں ماہرینِ فن
اس عظمت اور خدمت میں ہمہ دم اور ہمہ جہت مصروف ہیں۔

ہمدرد

ہمدرد کی فنّی محنت اور دواسازی
کی صلاحیت کا ایک مظہر ہے

جوشینا

نزلہ وزکام۔ جوشینا سے آرام
کھانسی اور سینے کی جکڑن کا موثر علاج

خدمت خلق رُوحِ اخلاق ہے

ADARTS

JOS-1/88

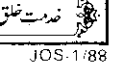

For Quality Products

ASIA

BATHROOM ACCESSORIES

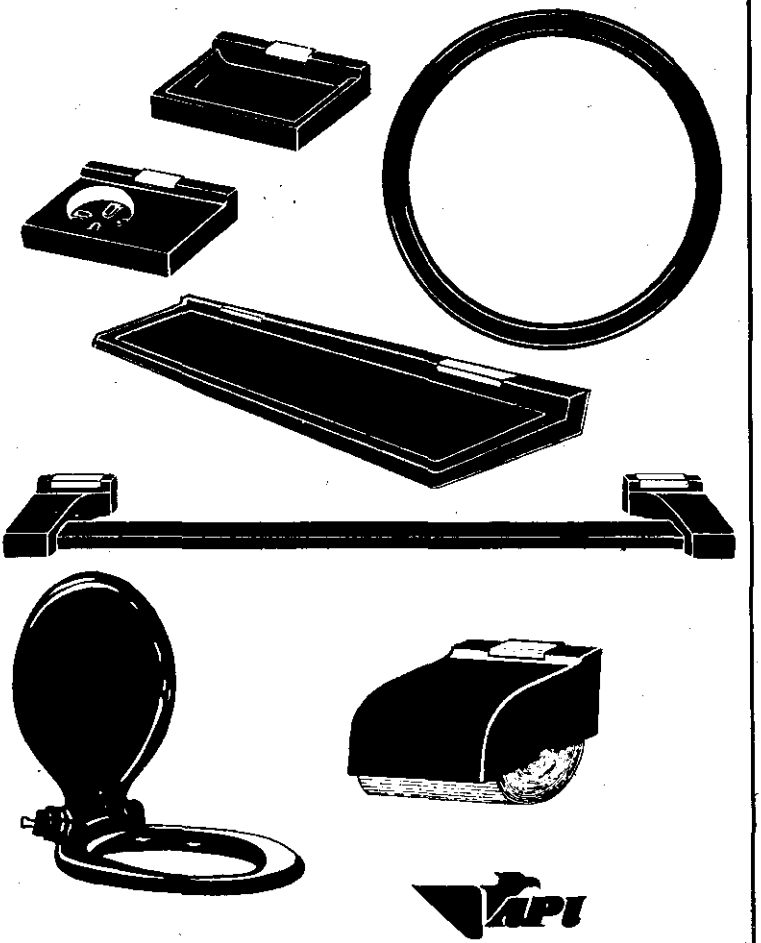

API

ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

استحکامِ پاکستان

پاکستان کیوں بنا ــــــ کیسے بنا
پاکستان کیوں ٹوٹا ــــــ کیسے ٹوٹا
اب ٹوٹا تو ـ ـ ـ ـ ـ ـ
پاکستان کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ
اندھیروں میں اُمید کی ایک کِرن
لفظ لفظ میں ــــ وطن کی محبّت
سطر سطر میں ــــ ایمان کی چاشنی
عمل کا پیغام ـ ـ ـ ـ ـ ـ

اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن
فون:

یادگار کتابیں

	قیمت		قیمت
اپنی نمازیں درست کریں، مولانا اشرف علی تھانوی	۲۵/-	خلاصۃ الاحادیث مترجم، مشہور احادیث کا مجموعہ	۳۳/-
ایمان و اقتدار، سیاسی لوگوں کے مطالعہ کیلئے	۲۴/-	حقیقت مذہب شیعہ، علامہ فیض عالم مرحوم	۸۰/-
سیرت حضرت جنیدؒ بغدادی، لاجواب تحفہ،	۲۴/-	ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت۔	۳۰/-
اسلام اور فرقہ پرستی، قابل دید کتاب	۲۵/-	والدین مصطفیٰؐ، رسول اللہؐ کے ماں باپ پر بااد تجربہ	۲۴/-
تصوّف کی حقیقت، توحیدیوں کے لیے انمول جوہر	۱۹/-	شہید مظلوم، ڈاکٹر اسرار احمد	۳/-

ردِ مرزائیت اور شیعیت پر بے شمار کتب موجود ہیں :

بذریعہ وی پی طلب کریں۔ عامر اکیڈمی ذیلدار روڈ اچھرہ لاہور۔

Jawad
Products

We are manufacturing and exporting ready made gar ments (of all kinds including shirts, trousers, blouses, jackets uniforms, hospital clothing; kitchen aprons), bedliner cotton bags, textile piece goods etc.

For furtner details write to :

M/s. Associated Industries (Garments) Pakistan (Private) Ltd.,

IV/C/3-A (Commercial Area),
Nazimabad,
Karachi - 18
Tele : 610220/616018/625594

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd. L. No. 7360
VOL. 38 No.
1989